

# کے جلال کی سرحد کی

رچرڈسن کے سخت متفر لہجے میں کہے اس فقرے کا نوٹس لیا تھا۔ جبکہ منصف تو تھا ہی ارباز کا قریبی دوست اور اپنے وطن کے بارے میں حد درجہ حساس بھی۔  
”ایک سیکورٹی سر! لیکن ذاتیات میں دخل اندازی کو ناپسند کرنا ہم نے آپ امریکنز ہی سے سیکھا ہے۔ یہاں والدین کو اولاد کے معاملے میں اور شوہر کو بیوی کے معاملے میں دخل دینے کو بھی بدتمیز ہی قرار دیا جاتا ہے تو پھر اگر ہم ایک آزاد قوم ہونے کی حیثیت سے اگر امریکہ یا کسی دوسرے ملک کی نکتہ چینی پہ احتجاج کرتے ہیں تو اسے غلط کیسے کہا جاتا ہے؟“

”تم ایشیائی میں یہی تو خرابی ہے کہ تمہارے بھلے کے لیے بھی اگر تمہیں کچھ کہا جائے تو تم اسے تعصب کی نظر سے دیکھتے ہو، اگر کسی غلطی کی نشان دہی کی جائے تو اسے بیرونی مداخلت قرار دے دیتے ہو۔“

پروفیسر رچرڈسن نے ارباز الیاسی کے اعتراض پہ برا مانتے ہوئے کہا لیکن ان کے رہنما کس پہ کلاس میں موجود گیارہ ایشیائی اسٹوڈنٹس نے زبردست نعرہ احتجاج بلند کیا، ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو ارباز کے نقطہ نظر سے متفق نہیں تھے لیکن انہوں نے بھی پروفیسر



منصف سے سوال اٹھایا۔

”جب آپ کا سپر پاور امریکہ کسی ٹوہ لینے والی پڑوس کی طرح ہر وقت اپنے ارد گرد رہنے والوں کی کمزوریوں کو پکڑتا رہتا ہے تو آپ اسے، ہائز کیسے قرار دے سکتے ہیں؟“

اس کی تقلید میں یہ دوسرا سوال ارباز نے اٹھایا۔

”ہم اس وقت چائلڈ لیبر پر بحث کر رہے ہیں۔“  
پروفیسر رچرڈسن نے بوکھلا کے اپنا چشمہ درست کیا۔  
موضوع سے ہٹ جانا اسے مزگرا تھا۔

”اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایشیائی ممالک خصوصاً ”ہندوستان“ پاکستان اور بنگلہ دیش وغیرہ ہیں دس سال سے کم عمر بچوں کی ایک بڑی تعداد محنت مزدوری کر کے اپنے گنبے کا پیٹ پالتی ہے۔ کیا تعلیم حاصل کرنا اور اپنے بچپن کی تمام تر معصومیت اور بے فکری کو انجوائے کرنا ان کا بنیادی حق نہیں ہے؟“

”اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امریکہ اور اس جیسے دوسرے مادی پر آزاد ممالک میں دس سال سے کم عمر بچوں کی ایک بڑی تعداد سڑکوں، فٹ پاتھوں اور یتیم خانوں میں دھکے کھاتی ہے کیونکہ یہ وہ نسل ہے جسے نہ باپ کا نام نصیب ہوتا ہے نہ ہی ماں کی گود۔ انہیں ان چاہی چیز کی طرح پیدا ہوتے ہی پھینک دیا جاتا ہے۔ کیا ایک فیملی میں رہنا اور تمام انسانی رشتوں کی محبت حاصل کرنا ان کا بنیادی حق نہیں ہے؟“  
منصف بقول ارباز کے چھڑچکا تھا۔

”مسٹر تارڈ، آپ بار بار موضوع کو متنازعہ بنا رہے ہیں۔“ پروفیسر نے شبہہ کی۔

”سرا میں صرف اپنی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان اور انڈیا کو چائلڈ لیبر کے حوالے سے بدنام کرنا سخت نا انصافی ہے۔ آپ کے اعداد و شمار کو میں غلط نہیں کہتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دونوں ممالک کی آبادی ان کے وسائل سے کہیں زیادہ ہے۔ دس دس بارہ بارہ افراد کے گنبے کا پیٹ پالنا ایک اسکیلہ شخص کے بس سے باہر ہوتا ہے، مجبوراً انہیں اپنے کم

سن بچوں کو مشقت کی اس بھٹی میں جھونکنارہا ہے۔ لیکن ایسا صرف نچلے طبقے میں ہوتا ہے، محنت کش طبقے میں۔۔۔ جبکہ دیگر لوگ اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کے بھی بچوں کی تعلیم و تربیت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس آپ یہاں امریکہ میں ہی دیکھ لیں۔۔۔ اچھے بھلے گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں پارٹ ٹائم جاب کرتے ہیں صرف اس لیے کہ ان کے والدین اپنی محنت کی کمائی اپنی ہی پیدا کی ہوئی اولاد پر صرف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ انہیں سیلف کانفیڈنس ابھارنے کا دھوکا دے کے۔۔۔ تو کبھی سیلف میڈ بننے کا خواب دکھا کے وہ انہیں ہری جھنڈی دکھا دیتے ہیں۔ یہ پارٹ ٹائم جاب جلد ہی فل ٹائم جابز کا روپ دھار لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں شرح خواندگی بڑھنے کے بجائے کم ہوتی جا رہی ہے۔ وہاں اگر کم سن بچے قایلین بنتے ہوئے اپنی انگلیاں فگار کرتے ہیں، ورکشاپوں میں دھوئیں اور

ڈیزل سے اپنے چہرے کالے کرتے ہیں، سڑکوں پر بڑھیاں لگا کے چیزیں بیچتے ہیں تو ایک طرح سے اپنی فیملی کا بوجھ بانٹتے ہیں لیکن جہاں کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں اسکول ٹائم کے بعد اسٹور کیپر یا بار بوائے اور ویٹرس بنتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے سر؟“

”زبردست منصف!“ بعد میں نیام نے اسے پرزور طریقے سے داودیتے ہوئے کہا۔ ”آج تو تم نے سر رچرڈسن کی بولتی ہی بند کروادی۔“

”ریش۔“ ساہ نے ناک چڑھائی۔ ”سر رچرڈسن کا تو اوپر والا خانہ ویسے ہی خالی ہے ورنہ ان کی اس قدر پودی و دلیلیں تو منٹوں میں چٹکی میں اڑائی جاسکتی تھیں۔“

”تو تم نے یہ چٹکی کیوں نہ بجائی؟“ ارباز نے کہا۔  
”میں کلاس روم میں ایسی بکواس بحث کرنے پر یقین نہیں رکھتی۔ یہ سب خود کو نمایاں کرنے کی نہایت اوجھی کوشش ہے ورنہ چائلڈ لیبر کہاں ہے کہاں نہیں، کون غلط ہے اور کون درست۔۔۔ اس سب پر بحث کرنے سے ہمیں کیا حاصل اور منصف



کر دینے والی پریتی دیون اپنی جنم بھومی ”بھارت“ کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اپنے دلش کا عقیدت سے ذکر کرنے والے اس کے مانا پتا سے بھارتی طور طریقے تو سکھائیٹھے تھے، لیکن کبھی بھارت لے جانے کا نام تک نہ لیا تھا۔

ارباز الیاس بھی ایک انڈین تھا۔ ایک انڈین مسلمان۔ وہ جتنا سچا مسلمان تھا، اتنا ہی محب وطن بھارتی شہری۔ اسے جتنا گاؤ اسلام سے تھا۔ اتنا ہی گریز وہ پاکستان کے نام سے کرتا تھا۔

”مذہب کے نام پر مٹی کو بانٹنا سراسر جذباتیت ہے۔“ اس مسئلے پر اکثر اس کی اپنے گہرے دوست منصف سے بحث رہا کرتی تھی۔

منصف علی تارڑ۔ جس کا تعلق پاکستان کے صوبے پنجاب سے تھا اور جو دہاتی بیک گراؤنڈ رکھتا تھا۔ اس کے والد ایک خوشحال زمین دار تھے اور وہ اپنے گھرانے کا واحد فرد تھا جو نہ صرف اعلا تعلیم حاصل کر رہا تھا بلکہ اس مقصد کے لیے امریکہ آیا ہوا

کی تو عادت ہے جہاں موقع ملے، اپنی مشرق پرستی کا راگ الاپنا شروع کر دیتا ہے اور کبھی کبھار تو اس میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے جیسے کہ آج۔“

ارباز نے اس کی تنقید پر مسکرا کے منصف کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی وہی مسکراہٹ تھی۔ پچھلے سات مہینوں میں وہ لوگ ساڑھ داؤد۔ عرف ساڑھ ڈیوڈ کی ایسی باتوں کے عادی ہو چکے تھے۔

”اگر کوئی ہم پر تنقید کرتا ہے تو کیا ہمیں اسے جواب نہیں دینا چاہیے؟“ رہچائی اگرچہ ساڑھ سے خاصی دوستی تھی لیکن موقع ملنے پر وہ بھی ارباز الیاس اور منصف کے ساتھ ہو جایا کرتی تھی۔

”چاہے وہ تنقید مثبت ہی کیوں نہ ہو؟“ ساڑھ نے پلیٹ کے پوچھا۔ ”او کم آن رہچا! اپنی کمزوریوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے بجائے اس کے کہ ان پر پردہ ڈال کے چھپانے کی بھونڈی کوشش کی جائے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ایشیا میں

خصوصاً ”مسلم ممالک میں خواتین اور بچوں کے بنیادی حقوق کی پامالی دھڑلے سے ہو رہی ہے اور انڈیا بھی اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں ہے حالانکہ قدامت پسندی اور بنیاد پرستی مسلمانوں کا وتیرہ ہے کیوں پریتی! تم کیا کہتی ہو؟“

اس نے ہمیشہ کی طرح پریتی کو پریتی کہہ کے مخاطب کیا۔

”میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ نہ میں انڈیا کے بارے میں کچھ جانتی ہوں نہ ہی انڈینز کے بارے میں۔“ اس نے بے چارگی سے شانے اچکائے۔

”بٹ یو آر انڈین۔“ ساڑھ نے حیرت سے کہا۔

”نوج انڈین۔“ ارباز نے اس کے گھنے سیاہ بالوں میں سے سیدھی نکلتی شفاف مانگ گندمی رنگت بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں لگے کاجل، کلائیوں میں کھنکھتی کالج کی چوڑیوں اور ناک کی لونگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیس آئی ایم۔۔۔ بٹ!“ اس نے ایک بار پھر شانے اچکائے اور یہ حقیقت تھی کہ دور سے ہی اپنی پہچان

ادارہ خواتین ڈائجسٹ  
کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو (سائیکلو پیڈیا)

شائع ہو گیا ہے

خوبصورت سرورق، آفٹ چھپائے، مضبوط جلد،

قیمت 450 روپے

پتہ ذیل سے خریدیں

• مکتبہ عمران ڈائجسٹ، اردو بازار کراچی

• احمد نیوز ایجنسی، فریئر مارکیٹ کراچی

• سلطان نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ لاہور

• اشرف بک ایجنسی راولپنڈی • مہران نیوز ایجنسی حیدر آباد

بلدیہ روڈ لاہور

37 اردو بازار



تھا۔

نیلیم سرور اس کا تعلق بھی پاکستان سے تھا مگر منصف کے برعکس وہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ آج اگر وہ امریکہ میں موجود تھی اور کولمبیا یونیورسٹی میں زیر تعلیم بھی۔۔۔ تو اس کی وجہ اس کی خوب صورت اور ذہین بڑی بہن مریم تھی۔ جو خود سے دگنی عمر کے ایک امیر کبیر شخص سے شادی کر کے اپنی فیملی کو اس اندھیرے سے نکالنے کی جگہ دو میں تھی جو سالوں سے ان پہ چھایا ہوا تھا۔ نیلیم کا بہنوئی سالوں سے امریکہ میں سیٹھ تھا، مریم سے شادی کے بعد اس نے نہ صرف اپنے بڑے سالے کو پاکستان میں بزنس سیٹ کرنے میں مدد دی بلکہ چھوٹے سالے کی کنڈا میں مقیم اپنی جان پہچان کی ایک فیملی میں شادی بھی کرا دی وہ وہاں گھر داماد بن کے مزے کر رہا تھا۔ مریم اپنی چار غیر شادی شدہ بہنوں میں سے دوسرے نمبر کی بہن۔۔۔ یعنی نیلیم سرور کو اپنے ساتھ امریکہ ہی لے آئی تاکہ اس کا رشتہ بھی کسی اچھی فیملی میں کرا دیا جائے۔

نیلیم سرور کی ظاہری شخصیت کو دیکھ کے یہ اندازہ بخوبی ہوتا تھا کہ وہ جیسی نظر آنے کی اپنی سی کوشش کر رہی ہے، دراصل ویسی ہے نہیں۔۔۔ ڈھائی سال سے امریکہ میں رہنے کے باوجود اس کی انگریزی اب بھی اکثر لڑکھڑاکے منہ کے بل گر جایا کرتی، اس نے خود میں کافی حد تک تبدیلیاں لانے کی کوشش کی تھی اور وہ اچھی خاصی ماڈر دکھائی دیتی تھی لیکن امریکن نقطہ نظر سے وہ اتنی ہی بیک ورڈ اور پیئڈ ٹائپ تھی۔ کسی حد تک ”لالی لگ“ نیلیم سرور کی اپنی کوئی رائے نہیں۔۔۔ کسی بھی معاملے میں نہیں۔۔۔ کبھی وہ سارہ داؤد کے ماڈرن ازم کی حامی تو بھی منصف کی روایت پسندی سے متاثر نظر آتی تھی۔

سارہ داؤد اطرابلسی۔۔۔ جو نیویارک میں سارہ ڈیوڈ کے نام سے جانی جاتی تھی۔ آدھی مسلم اور آدھی یورپین تھی۔ اس کا باپ سیدی داؤد اطرابلسی تونس سے تعلق رکھتا تھا جبکہ ماں کا تعلق فرانس سے تھا۔ مسلم باپ اور فرینچ ماں کی ملی جلی شباهت لیے ہوئے

سارہ داؤد کے دل و دماغ یہ اس کی ماں کا پکا اثر تھا۔ ویسے بھی باپ کا تعلق زندگی کے ابتدائی گیارہ سال تک رہا پھر دونوں کے مابین علیحدگی ہونے کے بعد اس کی ماں اسے لے کے امریکہ آن بسی جبکہ باپ فرانس سے واپس اپنے وطن تونس میں شفٹ ہو گیا۔

ریچا سمن اس گروپ میں شامل ایک اور انڈین۔ اس کے اور منصف کے حالات خاصے ملتے جلتے تھے۔ اس کی طرح وہ بھی ایک روایتی مگر کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور بریلی سے میاں تعلیم حاصل کرنے آئی تھی۔ قبول صورت ریچا کی زیادہ دوستی اپنی ہم وطن اور ہم مذہب بریتی کے بجائے سارہ سے تھی حالانکہ دونوں کالاف اشاگل بالکل مختلف تھا۔ آزاد خیال ہونے کے باوجود ریچا کی آزادی محض ”خیال“ کی حد تک ہی محدود تھی۔ اپنے خاندان کی روایات کو اس نے امریکہ میں اکیلے رہنے کے باوجود خاصی حد تک برقرار رکھا ہوا تھا۔ اور بریتی دیوں۔

پورے گروپ میں واحد جو ایک بھری پری مکمل فیملی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے والدین عرصہ دراز سے امریکہ میں مقیم تھے۔ کونینڈ کمیونٹی ہاسپٹل میں تعینات دونوں ڈاکٹر میاں بیوی اپنے مذہب سے گہری عقیدت رکھنے کے باوجود ہندوستان سے وابستگی نہ ہونے کے برابر رکھتے تھے۔ بریتی کے تین چھوٹے بھائی نکھل، مکمل اور اتل تھے جو مکمل امریکی رنگ لیے ہوئے تھے لیکن بریتی اپنے والدین کی کچھ شعوری اور کچھ لاشعوری کوششوں کی وجہ سے اس رنگ میں نہ رنگ سکی۔ اس کا اردو کالب و لہجہ بالکل صاف اور رواں تھا، وہ ہندی فلموں اور موسیقی کی دلدادہ تھی، وہ کرتا شلوار شوق سے پہنا کرتی اسے ہندوستانی زیورات چوڑیاں، کنگن، پائل، بندیا بھی بے حد بھائی تھیں شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ تینوں بھائی گھر کی بجائے دن کا بیشتر حصہ باہر گزارا کرتے۔ اس لیے باہر کا اثر لینے میں انہیں زیادہ وقت نہ لگا، جبکہ بریتی کو اس کے پتا ڈاکٹر ابھے کی جانب سے کچھ پابندیوں کا سامنا



”سب تمہاری ڈھیل کا نتیجہ ہے فیہنا۔ تم اپنے بچوں کو سنسکار دینے میں ناکام رہی ہو۔ وہ دن بدن اپنے دھرم سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔“

”اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے ابھی۔“ بالآخر فیہنا نے وضاحت کی۔

”یہ لایالی پن ان کی نیچر میں شامل ہے۔ میں دھرم انہیں گھول کے تو نہیں پلا سکتی۔ اب پریتی کو ہی دیکھ لو یہ چاروں ایک ساتھ پلے ہیں۔ ایک ہی گھر میں۔۔۔ ایک ہی مانتا پتا کی گود میں۔۔۔ اور ایک جیسے ہی سنسکاروں کے ساتھ۔۔۔ لیکن چاروں کی نیچر اور عادتیں الگ الگ ہیں۔“

”اس لیے کہ پریتی شروع سے ہی مجھ سے اٹیچ رہی ہے جبکہ بیٹے تمہارے لاڈلے جیسے تمہارے لیے دھرم ایک روئین کی چیز ہے اور تم ہفتے میں ایک آدھ بار بھگوان کے آگے سے گزرتے ہوئے سرسری سا پرنام کر لیا کرتی ہو یا پھر سال میں دو ”برت“ رکھ کے سمجھتی ہو کہ تم نے ایک شدھ ہندو ناری ہونے کا دھرم نبھادیا ہے، اسی طرح تمہارے بیٹوں کے لیے بھی دھرم بس ایک ٹیک ہے جسے وہ اپنے ناموں کے آگے لگائے پھرتے ہیں۔“ وہ تلخی سے کہتے ہوئے کرسی دھکیل کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جانے کے بعد فیہنا نے سر جھٹکا اور ہاتھ میں رکھا تو سب بے دلی سے پلیٹ میں واپس رکھ دیا۔

پریتی کے لیے یہ نئی بات نہیں تھی۔ اس کے والدین کی انڈر سٹیڈنگ دیگر معاملات میں قابل رشک تھی۔ انہیں بلاشبہ ایک آئیڈل جوڑا قرار دیا جاسکتا تھا۔ صرف یہ واحد چیز ایسی تھی جس پر دونوں کا اختلاف کھل کے سامنے آجایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر ابھی کو اپنے شدھ برہمن ہونے پر بہت فخر تھا جس کا وہ برملا اظہار بھی کیا کرتا۔ یہ اسی کا کٹر عقیدہ تھا کہ امریکہ میں ساہا سال سے رہنے کے باوجود ان کی فیملی اب بھی مدھیہ پردیش کے کسی قدیم مندر میں سانس لے رہی تھی۔ ڈاکٹر ابھی نے کئی سال پہلے یہ گھر ”واستو شاستر“ کے اصولوں کے عین مطابق بنایا تھا۔ مشرق کی

بچپن سے ہی رہا، اسے بلا ضرورت اور پلا اجازت گھر سے دیر تک باہر رہنے کی عادت نہیں تھی اور گھر کے ماحول میں حیرت انگیز طور پر مشرقی اور مذہبی رنگ نمایاں تھا، یہی وجہ تھی کہ امریکہ میں پلنے بڑھنے کے باوجود پریتی دیون، سر پلا ایک مکمل ہندوستانی لڑکی نظر آتی تھی۔



یہ کوئٹہ کے ایریا میں واقع پریتی دیون کے خوب صورت گھر میں اترنے والی صبح کا منظر ہے۔

”اوم بے جگدیش ہرے۔۔۔“

سوامی بے جگدیش ہرے۔۔۔“

گھنٹی کی آواز کے ساتھ یہ مانوس بول ڈاکٹر ابھی کی آواز میں پریتی کے کانوں میں اتر رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی۔ جو گز رہنے کے بعد اس نے دستاں چڑھائے اور مفلر اپنے گرد اچھی طرح پلیٹ کے نیچے اتر آئی۔

”گڈ مارنگ مام۔۔۔“ کچن میں جھانک کے اپنی ماں ڈاکٹر فیہنا سے کہنے کے بعد وہ گھر میں بنے چھوٹے سے مندر کی جانب چلی آئی جہاں بھگوان رام، سیتا اور کرشن کی مورتیوں کے آگے ڈاکٹر ابھی پوجا کا تھال لیٹا کرنے میں مصروف تھا۔

”نمستے پاپا۔“ اس نے کبھی انہیں ”گڈ مارنگ“ کہنے کی بھول نہیں کی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کے پاپا کو یہ پسند نہیں۔ ڈاکٹر ابھی نے مسکرا کے اپنی بڑی بیٹی کو دیکھا جو اب مورتیوں کے آگے ہاتھ جوڑے، آنکھیں موندے اس کے برابر کھڑی نا محسوس طریقے سے ہلتے لبوں کے ساتھ پاٹ کر رہی تھی۔

”تمہارے بھائی کہاں ہیں؟ کیا روز کی طرح آج بھی پوجا کیے بغیر نکل گئے؟“ وہ خاموش رہی۔ ابھی نے اس کے ماتھے پر تلک لگا کے آشیرواد دینے کے بعد ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنے بیٹوں کی لاپرواہی اور نافرمانی پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دینا شروع کیا جو ناشتے کے دوران بھی جاری رہا۔



کھاتے کہ ان میں انڈا شامل ہوتا ہے جس کو کھانے سے ان کا ”شاکاہاری“ (وہجی ٹیرین) دھرم خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ مائی گاؤں زندگی کے ہر لطف سے دور رہنا ہی کیا دھرم ہے؟“

”زندگی کا لطف صرف انڈے اور گوشت میں نہیں رکھا مائی ڈیرین! زندگی کا اصل مزا ”پریم“ میں ہے اور پریم انسان کو دوسرے کی خوشی کے لیے من مارنا سکھاتا ہے۔ یہ میرا پریم ہے کہ میں بہت سی باتوں کو ناپسند کرنے کے باوجود صرف ابھے کی خوشی کے لیے اپنا بچہ مجبور ہوں اور شاید یہ تمہارے پتا کا پریم ہے بھگوان جی سے کہ وہ ان کی خوشی کے لیے اپنے دھرم پہ اتنے پکے ہیں۔“

دھرم پریتی کی سمجھ میں کبھی بھی نہیں آیا تھا مگر ”پریم“ کا فلسفہ وہ آسانی سے سمجھ سکتی تھی اس لیے سر ہلا کے رہ گئی۔ وہ بھی تو اپنے دھرم کی روح میں اترے بغیر صرف اپنے پیپا کو خوش رکھنے کے لیے وہی کرتی آئی تھی جو وہ چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا، پوجا سے من کو شانتی ملتی ہے۔ وہ پوجا کرتی تھی، اس سے من کو شانتی ملتی تھی یا نہیں وہ نہیں جانتی تھی لیکن اسے پوجا میں مصروف دیکھ کے جب ڈاکٹر ابھی کے چہرے پہ خوشی اور فخر کے رنگ پھیلنے لگے تب وہ بے حد شانت ہو جایا کرتی۔

”نانا! آج آپ کا ڈے آف ہے تو کیا میں آپ کی کار لے جا سکتی ہوں؟“

”کیوں آج ٹیوب سے جانے کا دل نہیں چاہ رہا کیا؟“

”ایکچو نلی مجھے رجمنڈ ہلز سے رہا اور بروک لین سے سارہ کو لیتے ہوئے شاپنگ کے لیے جانا ہے۔ نیلم نے پارٹی میں انوائیٹ کیا ہے ڈریسز کے ساتھ ساتھ اس کے لیے گفٹ بھی سلیکٹ کرنا ہے۔“

”اوکے، بٹ بی کیئر فل، سن رائز ہائی وے پہ ڈرائیونگ آسان کام نہیں۔“ ڈاکٹر نے نانا نے تاکید کے ساتھ اجازت دے دی۔

جانب کھلنے والی کھڑکیوں کے سامنے ایک اونچی جگہ پہ بنائے گئے مختصر مندر میں ہر بھگوان کی مورتی رکھی تھی جس کے آگے پوجا میں استعمال ہونے والے تمام لوازمات کا اہتمام بھی لازمی ہوتا۔ ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے وہ اپنے خاص پنڈت جی کو بلوا کر پہلے کنڈی کے ذریعے مورتی نکلواتا اور پھر اس کام کا آغاز کیا جاتا۔ اس کے برعکس ڈاکٹر نے ایک اعتدال پسند ہندو خاتون تھی۔ وہ اپنے بچے کے مذہبی جذبات کا احترام ضرور کرتی تھی اور مقدور بھر مذہبی فرائض بھی ادا کیا کرتی لیکن اکثر اوقات دبے دبے الفاظ میں ابھے کو اس کی شدت پسندی پہ ٹوک بھی دیا کرتی جیسا کہ آج ہوا تھا۔

”بھئی پیپا یہ کبھی کبھی بہت حیرت ہوتی ہے۔ پتا نہیں وہ اور ہم سے کیا چاہتے ہیں؟“ نکھل جو اندر اپنے کمرے میں شاید پیپا کے جانے کا ہی منتظر تھا باہر نکلتے ہوئے آکٹا ہٹ بھرے لہجے میں بولا۔

”میرے اور بھی بہت سے انڈین دوست ہیں لیکن کسی کی بھی فیملی میں دھرم کو لے کر اتنی پابندیاں نہیں لگائی جاتیں جتنی ہمارے گھر میں ہیں۔ اشناں کیے بغیر ہم رسوئی میں نہیں جاسکتے، ہمارے گھر میں میٹ (گوشت) نہیں آسکتا، پوجا کے اور تلک لگائے بغیر باہر نہیں جاسکتے۔“ وہ چڑکے ایک ایک پابندی گنوارہا تھا۔

”تو نکھل! کیا تم میٹ نہیں لیتے؟“ پریتی نے خود سے چار سال چھوٹے بھائی کو ٹوکا۔ ”میں اور مام ہی کیا، پیپا بھی یہ جانتے ہیں کہ تم میٹ لیتے ہو، نہ صرف تم بلکہ مکمل اور اہل بھی برہائی، برگر اور پزا وغیرہ یہ جانے بغیر کھا لیتے ہو کہ اس میں کون سا میٹ شامل ہے۔ پھر

چاہے وہ گنوماتا کا ہو یا پورک ہو۔ پیپا تم سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس گھر میں میٹ نہ آئے کیونکہ یہاں وہ پوجا کرتے ہیں، اس سے ان کے دھارمک جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے تو کیا تم ان کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ ماما بھی تو پیپا کی خوشی کے لیے اتنا کچھ کرتی ہیں اور میں بھی۔۔۔ پھر چاہے دل سے ہمیں وہ پسند ہو یا نہ ہو۔“

”پیپا کا کیا ہے۔“ وہ ٹوئیک اور بسکٹ تک نہیں



”اوبائی گاڈ۔۔۔ اس منصف؟“ سارہ حیرت سے چلائی۔

وہ تینوں اس وقت Blooming Dolas میں شاپنگ کر رہی ہیں، جب سارہ نے ان دونوں کی توجہ ایک کاؤنٹر پہ سیلز مین کے روپ میں کھڑے منصف کی جانب دلائی۔

”رہنے دو سارہ! ہو سکتا ہے، ہمیں دیکھ کے وہ اچھا محسوس نہ کرے۔“ سارہ کو منصف کی جانب لپکتے دیکھ کے رہ جانے روکنا چاہا۔

”اس نے کبھی اپنی اس پارٹ ٹائم جاب کے بارے میں ذکر نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے وہ نہ بتانا چاہتا ہو۔“ لیکن سارہ نے اس کی بات کی پروا نہیں کی۔

”جسٹ آمنٹ یار“ میں ابھی آتی ہوں۔“ اور انہوں نے دیکھا کہ سارہ کے اچانک وہاں چھاپ مارنے کے سے انداز میں جانے کے باوجود منصف کے چہرے پہ نہ تو حیرانی تھی نہ پریشانی۔ اس کے برعکس وہ بڑے فارمل انداز میں اس سے بات کر رہا تھا، اس دوران شاید سارہ کے اشارہ کر کے ان دونوں کے متعلق بتانے پہ اس نے ایک اچھٹی سی نظر اس طرف بھی ڈالی تھی، پریتی کو متوجہ دیکھ کے منصف نے سر ہلا کے اسے وش کیا تو اور رہ جانے کو بھی جانا ہی پڑا۔ اپنی شاپنگ کی پیکنگ کروا کے وہ منصف کے کاؤنٹر کی جانب برہمیں تو ماحول یکسر بدلا ہوا پایا۔ منصف کے چہرے پہ گہری سنجیدگی تھی جبکہ سارہ کا چہرہ تہمتا رہا تھا۔ اس کے سختی سے بچنے لب اس کے غصے کو ظاہر کر رہے تھے جبکہ نیلی آنکھوں سے لپکتے شراروں کا رخ منصف کی جانب اشارہ کر رہا تھا کہ یہ غصہ ضرور اسی کی کسی بات یا حرکت کا نتیجہ ہے۔

”سم تنگ سیریس؟“ رہ جانے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ سارہ سر جھٹک کر اور پھر بچتے ہوئے واپس مڑ گئی۔ منصف اسے دیکھ کے یوں مسکرایا جیسے کسی ضدی بچے کی معصوم مگر بے حد تنگ اور عاجز کر دینے والی حرکت پہ بے بسی سے مسکرایا جاتا ہے۔

”غالبا“ تم بھی پہلا سوال مجھ سے یہی کرو گی کہ منصف علی مارڈ، تمہارے والد کی ان زمینوں، جاگیروں اور حویلیوں کا کیا ہوا، جن کا تم ذکر کیا کرتے تھے یا پھر تمہیں کسی نامعقول حرکت پہ عاقل کر دیا گیا ہے جو تم اس اسٹور پہ ٹائیاں اور بنیاں بیچنے پہ مجبور ہو۔“

”ایک تو یہ سارہ۔۔۔“ رہ جانے تاسف سے سر ہلایا۔ اسے قطعی توقع نہیں تھی کہ سارہ جو منصف کو دیکھ کے اس بے تابی سے اس کی جانب لپکی تھی تو اصل میں وہ بے تابی اس طنز کو اگلنے کی تھی۔ پریتی بھی کچھ نہ کرنے کے باوجود شرمندہ سی نظر آئی۔

”ویسے کرنا چاہو تو تم بھی یہ سوال، بخوشی کر سکتی ہو“ بے فکر رہو، میں تمہیں وہ جواب ہرگز نہیں دوں گا جو سارہ۔۔۔ وہ آئی مین سارہ کو دیا تھا۔“

”یو آر ٹوچ منصف! ضرور تم نے ایک کے بدلے دس سنائی ہوں گی۔“ رہ جانے کو اندازہ تھا کہ وہ ادھار رکھنے کا قائل نہیں خصوصاً ”سارہ کے ساتھ تو وہ اکثر لڑا کا عورتوں کی طرح لڑا کرتا تھا۔“

”نہیں بھئی، اتنا فضول خرچ نہیں ہوں میں۔۔۔ اس نے ایک ہی بات کی تھی کہ میں یونیورسٹی میں خود پہ خول چڑھائے پھرتا ہوں، ڈبل پرسنلٹی کا مالک ہوں، جواب میں میں نے بھی ایک ہی۔۔۔ بس ایک ہی بات کی تھی، بلیوی۔“

رہ جانے اور پریتی دونوں نے اس ”ایک ہی بات“ کی تہہ تک جانے کے بجائے اسٹور سے باہر نکلنا زیادہ مناسب جانا جہاں سارہ اس سے زیادہ ان کی منتظر نہیں رہ سکتی تھی۔

”سمجھتا کیا ہے خود کو ٹٹ پونہ جھا۔“ وہ حسب توقع دانت پیس پیس کے ”اس ایک ہی بات“ کی بھڑاس نکال رہی تھی جس کی شدت کا اندازہ پریتی کو اس کے غصے اور تلملاہٹ کو دیکھ کے با آسانی ہو رہا تھا کہ وہ بات کس درجہ کمال کی ہوگی۔

”اگر ایسا ہی لینڈ لارڈ ہوتا تو یہاں سیلز بوائے بن کے کھڑا کیوں ہوتا۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا یہ شخص



لیے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ شاید اس کا انفرادیت کا شوق بھی ہو ورنہ اس کی فیملی کی جانب سے ایسی کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔ ایک حد میں رہتے ہوئے تو امریکن ڈریسز نیلیم سرور جیسی کل کی پاکستان سے آئی سمٹی سٹائل کی لڑکی بھی پہن لیتی تھی۔ رہ جانے جوڑی وار چست پاجامے کے ساتھ اتنا ہی چست اور گھٹنوں سے اوپر سیلیولیس کرتا پہن رکھا تھا، جس کا گربان اچھا خاصا کھلا تھا، کرتا جتنا مختصر تھا، چنا ہوا دوپٹہ اتنا ہی لمبا۔ لمبے بالوں کی چوٹی، ماتھے پر میچنگ بندیا، فل میک اپ، گلابیوں میں بھر بھر کے پتلی کانچ کی چوڑیاں، پیروں کی پازیب اور لکے ہوئے بندے۔ اس پاس سے گزرنے والے ہر شخص کو متوجہ کر رہے تھے۔ اس کے ایسے ہی طیلے کے باعث ارباز الیاسی اسے چڑکے ”چھمک چھلو“ بھی کہا کرتا تھا۔

”یہ ہے تمہاری سو کالڈ مشرقیت، جس سے متاثر ہو کے وہ دو لکے کا شخص۔۔۔ وہ منصف، مجھے باتیں سنا رہا تھا، میرے ڈریس کو کرٹی سائز کر رہا تھا۔“

اب اس کی تلملاہٹ کی وجہ پریتی کی سمجھ میں آئی۔ اس نے ذرا غور سے سارہ ڈلوڈ کا جائزہ لیا۔ چست بلیک ڈینم میں اس کی کمان سی کمر اوپر منڈول ٹانگوں کی ساری خوب صورتی واضح ہو رہی تھی جبکہ بالشت بھر کا آف شولڈر ٹاپ اسے بڑی حد تک عیاں کر رہا تھا۔ عریاں پشت پر بنے ٹائوڈ دعوت نظارہ دے رہے تھے۔

”یقیناً“ اس نے یہ بھی کہا ہو گا کہ تم ایک ڈبل پرسنلٹی کا شکار لڑکی ہو اور خود پہ خول چڑھائے رکھتی ہو۔“ وہ جان گئی کہ مصنف نے وہ جو ایک ہی بات کی تھی دراصل اس کی بات اسے لوٹائی ہوگی۔

”ہاؤ یو نو۔۔۔“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ ”ٹائو لیواٹ بار، منصف کا سمجھنا پتا ہی ہے، اس کے دل میں کچھ نہیں ہوتا بس یونہی بولتا رہتا ہے۔“ رہ جانے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا ”اور اپنے کلچر کے بارے میں وہ زیادہ ہی جچی ہے۔“

”جچی نہیں رہ جانے وہ کنزرویٹیو ہے اور وہی نہیں بلکہ

انتہائی بڑبڑلا، آگئی اور شنی خور ہے یہی نہیں بلکہ حد سے زیادہ وقیانوسی اور بوسیدہ سوچ رکھتا ہے۔ ہونہ، کتا ہے میں ہنس کی چال چلنے کی کوشش میں اپنی چال بھی بھولتی جا رہی ہوں، مالی فٹ، مجھے کوا کہا اس نے۔“

”اوہ ویری سید، یہ تو بہت بری بات ہے۔“ پریتی نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے ہمدردی سے کہا جبکہ رہ جانے یہ تکلف کیے بغیر بے دھڑک قہقہہ لگایا تھا۔

”اوشٹ اپ یو انڈین جھٹکا مٹکا ہیروئن۔“ اس نے رہ جانے کو لتاڑ کے رکھ دیا۔ اس کے ہر وقت مشرقی انداز میں نک سب سے تیار رہنے اور فلمی ہیروئنز کے فیشن کا پی کرنے کی وجہ سے اس کا نام ”جھٹکا مٹکا“ مسالہ ہیروئن ”مشہور ہو چکا تھا۔ ”دیو داس“ میں ایشوریا جیسے نکلن مادھوری جیسی ساڑھی۔ ایشا جیسا کرتا شلوار۔۔۔ پاشا کایٹر اشائل اور فلاں کے جھمکے۔۔۔ ڈھمکال کی بندیا۔۔۔ یہ اس کی گفتگو کا خاص موضوع تھا۔

”یہ سب تمہارے اس فینسی گیٹ اپ کا نتیجہ ہے اینڈ یو آلو پریٹی۔ کم آن فرینڈز، کچھ تو چٹچلاؤ خود میں اور کچھ نہیں تو شاپنگ یا آؤٹنگ کے وقت تو یہ عجیب و غریب ڈریسز مت پہنا کرو۔“

پریتی مکمل انڈین ڈریسز تو نہیں پہنتی تھی، خصوصاً ”گھر سے باہر نکلتے ہوئے۔ گھر میں وہ شلوار قمیص یا کرتا پاجامہ ہی پہنا کرتی۔ تمواروں اور اپنی کیونٹی کے فنکشنز کے لیے وہ بڑے اہتمام سے پور انڈین ڈریسز جیسے گھاگرا چولی، ساڑھی وغیرہ بنوایا کرتی لیکن باہر جانے کے لیے اس نے خاص ایسے ڈریسز بنا رکھے تھے جو مغربی ٹیچ لیے ہونے کے باوجود مشرقی حیا کے تمام تر تقاضے پورے کرتے تھے۔ جینز کے ساتھ گھٹنوں تک چھوٹے امبر اینڈڈ کرتے یا کارڈیگن، ٹخنوں تک آئی لانگ اسکرٹ کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور اسکارف وغیرہ۔ آج بھی اس نے میوون اور براؤن چیک کا ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر پہن رکھا تھا، اوپر میوون گرم جیکٹ اسے بے حد یاد قار بنا رہی تھی جبکہ رہ جانے حسب معمول مکمل انڈین اشائل



تمہارے آس پاس منڈلاتے دیکھا ہے۔“

”پلیز مجھے اس معاملے میں مت ٹھیکو۔“ پریتی نے ہاتھ جوڑے۔ اس نئے انکشاف نے اسے بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔ درحقیقت وہ خاصی اپنی آپ میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ ہو سکتا ہے سارہ کا مشاہدہ درست ہوتا، اس نے بھلا کب غور کیا تھا اور اگر ایسا ہی ہے تو واقعی خطرے والی بات تھی۔ سارہ نے منصف کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے جو اس کے پیلا اکثر مسلمانوں کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ سارہ کی تنقید کی زد میں صرف پاکستانی مسلمان اور بالخصوص مسلمان مرد آتے تھے جبکہ ڈاکٹر ابھے کو دنیا بھر کے مسلمانوں سے چڑھتی اور وہ پریتی کی دوست لڑکیوں میں بھی کسی مسلمان لڑکی کا ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ سارہ کی اس سے دوستی تقریباً دو سال پرانی تھی اور باوجود اس کے یہ کہ وہ نام کی حد تک ہی سہی، مسلمان کہلاتی جاتی تھی، ڈاکٹر ابھے نے زیادہ ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی اس لیے کہ وہ اپنے مسلمان باپ کے بجائے یہودی ماں کے ساتھ رہتی تھی اور اس کے زیر اثر تھی لیکن سلیم سرور سے اپنی دوستی کو اس نے ماں کی ہدایت پر اب تک چھپایا ہوا تھا، ویسے بھی اس دوستی کو زیادہ وقت نہ ہوا تھا۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہو سکتی ہے سارہ! سب پاکستانی ایک جیسے نہیں ہوتے بلکہ ان فیکٹ کسی بھی قوم کے سب لوگ ایک جیسی فطرت نہیں رکھتے۔ ہر ملک اور قوم میں کچھ اچھے تو کچھ برے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ انڈیا اور پاکستان میں سفارتی اور سیاسی لحاظ سے بھلے اختلافات اور تنازعات رہے ہوں لیکن میں اس شدت پسندی کی مخالف ہوں کہ اس کی وجہ سے سب پاکستانیوں کو برا بھلا کہا جائے۔ اس ملک کی اپنی ایک مضبوط ثقافت اور ٹھوس پہچان ہے۔ میں نے وہاں کے ٹی وی ڈرامے دیکھے ہیں۔ بہت کچھ انڈیا جیسا ہونے کے باوجود بہت کچھ الگ سا بھی ہے۔ تقریباً ایک جیسی زبان۔۔۔ لیکن وہ لوگ کتنا صاف بولتے ہیں۔ کھانا

سب مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں ورنہ تم اور ارباز دونوں ہی انڈین ہو، پھر تمہاری اور اس کی سوچ میں اتنا فرق کیوں ہے؟۔۔۔ اس لیے کہ وہ مسلم ہے اور تم نہیں۔۔۔ ورنہ کچھ تو تم دونوں کا ایک ہے، جب کبھی کبھار ڈسکو چلے جانے، ایک آدھ ہنگ پی لینے یا کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پہ چلے جانے سے تمہاری ویلیو پر کوئی بجلی نہیں گر جاتی تو اس اکیلے ارباز کا کچھری کیوں خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ دی آنسرا سو سمپل۔۔۔ لی کاڑی از مسلم۔“ اس نے چبا چبا کے کہا۔

”جہاں تک مجھے علم ہے سارہ۔۔۔ تم بھی مسلم ہی ہو۔“ پریتی نے جتایا۔

”سارہ داؤدا طرابلسی۔“

”فارگٹ اٹ۔۔۔“ اس نے ہاتھ ہلایا۔ ”میرے فادر ضرور مسلم ہیں۔ میں تیونس جاتی رہتی ہوں، وہاں میں نے اپنی فادر کی ٹیمیلی میں ایک مسلم ٹیمیلی میں بھی وہ سب نہیں دیکھا جو یہاں امریکہ میں ان مسلم ٹیمیلینز کے ہاں دیکھتی ہوں جو پاکستان سے تعلق رکھتی ہیں۔ تیونس میں سب کچھ ہے، ٹائٹ کلب، بار، کیسینو، جسے مسجد یا کسی اور مذہبی مقام پہ جانا ہوتا ہے، وہ جاتا ہے لیکن کلب یا کیسینو جانے پہ بھی کوئی پابندی نہیں ہے، جسے لانگ ڈریس کے ساتھ اسکاٹ لینا ہوتا ہے تو اس اوکے، وہ لے سکتی ہے لیکن دوسرے ڈریسز پہننے والیوں پہ لعن طعن نہیں کی جاتی جیسے یہ پاکستانی گرتے ہیں۔ سخت بد تہذیب قوم ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنا بھی نہیں جانتی۔ دوسروں پہ تنقید کرنا اور زبردستی ان پہ اپنے فرسودہ نظریات ٹھونکنا ان لوگوں پہ فرض ہے۔“

”لیکن ہمارے ساتھ تو منصف نے کبھی کوئی مسئلہ نہیں پیدا کیا۔ ہاں تم سے اسے۔۔۔ یا پھر تمہیں اس سے کچھ پرالہمز ضرور رہی ہیں، اس کی کوئی اور وجہ بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو راجا سین! ایک انڈین۔ تم انڈینز اور پاکستانیوں کا جھگڑا تو بڑی مشہور کہانی ہے اور تم بھی پریتی، بی کیئر فل۔۔۔ منصف کو میں نے اکثر

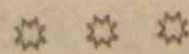


بھی قریب قریب ایک جیسا ہی ہے اور مائی گاڑ۔ وہاں بیوی کس قدر ہے۔ اتنی خوب صورت عورتیں۔۔۔ انڈیا میں تو صرف فلمز اور ٹی وی پلے میں ہی دیکھنے کو ملتی ہیں جبکہ وہاں جا بجا پھیلی ہوئی ہیں۔

”ہاں“ اسی لیے وہاں کے مرد ایک کے بجائے چار چار شادیاں کرتے ہیں۔ ”سارہ نے مذاق اڑایا۔

”سارہ! کیا یہ واقعی سچ ہے کہ مسلمان مرد چار چار شادیاں کرتے ہیں؟“ پریتی نے ہزار بار کی سنی بات کی تصدیق چاہی۔ وہ کوئٹہ بلوچستان میں رہتے تھے جہاں معمول انڈینز اور پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد رہائش پذیر تھی لیکن ڈاکٹر ایچ کی ناپسندیدگی کی وجہ سے ان کا کسی مسلم فیملی سے برائے نام ربط بھی نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے بارے میں وہ اتنا ہی جانتی تھی جتنا اپنے پیپا سے سن رکھا تھا، ”دوسری طرف منصف، نیلم، ارپاز اور اس جیسے دوسرے جان پہچان والے مسلمانوں کے بارے میں وہ ذاتی طور پر جو رائے قائم کرنے کے قابل ہوتی وہ اس سے یکسر مختلف تھی۔ وہ مسلمانوں کے بارے میں ڈبل مائنڈ ہو چکی تھی۔

”چار بھی کر لیتے ہیں اگر موقع ملے تو۔۔۔ ورنہ دوسری تو ضرور کرتے ہیں یوں تو دوسری شادی کرنے میں کیا ہے۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ لیکن ایک کے ہوتے ہوئے دوسری شادی۔۔۔ ڈس گسٹنگ بعض تو ایک ہی گھر میں دو دو تین تین بیویاں یوں رکھتے ہیں جیسے یہ عام استعمال کی چیزیں ہوں، جیسے بندہ وارڈ روب میں بہت سے ڈریسز لٹکا لیتا ہے کہ جب جو دل چاہے پہن لیا جائے۔ یا پھر جیسے بونے ڈنر۔ ایک وقت میں مختلف ڈانٹے۔“ اس نے کراہیت سے جھرجھری لے کے کہا۔ یہ وہ معاملہ تھا جس پر راجھا بھی منصف کے لیے سو فٹ کارنر رکھنے کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی۔



”بائی داوے نیلم! یہ پارٹی ہے کس خوشی میں؟“ اچانک راجھا کو بیٹھے بیٹھے خیال آیا۔ وہ سب اس وقت کافی ہاؤس میں بیٹھے نیلم کے ہاں پارٹی میں جانے کے

لیے اپنی اپنی کنوینس پر ایلم ڈسکس کر رہے تھے منصف اور ارپاز کے لیے تو کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن لڑکیاں رات کے وقت ٹیوب سے آنے میں ہچکچا رہی تھیں۔ سارہ البتہ مطمئن تھی، اسے رات کے کسی بھی وقت گھر سے باہر رہنے میں کوئی پر ایلم نہیں تھی البتہ راجھا اور پریتی کے لیے مشکل تھا۔ پریتی چاہتی تو منگل یا منگل میں سے کوئی بھی اسے ڈراپ کر سکتا تھا لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے پیپا تک یہ خبر کسی طرح پہنچے کہ اس کے سرکل میں ایک ایسی مستکم لڑکی ہے جس سے وہ اس حد تک قریب ہو چکی ہے کہ اس کے گھر تک آنا جانا شروع کر دیا ہے، دوسری طرف وہ نیلم کے اتنے پیار سے دیے بلاوے کو مسترد بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ پر ایلم بھی سارہ نے حل کر دی۔

”ڈونٹ وری یار! میں مام کی کار لے آؤں گی ویسے بھی انہیں جانا ہی کہاں ہوتا ہے۔“

”بائی داوے، نیلم! یہ پارٹی ہے کس خوشی میں؟“ راجھا نے پھر سوال کیا۔

”یہ افطار پارٹی ہے، میرے بہنوئی نے خاصے بڑے پیانے پر رکھی ہے، پیانے کہا کہ میں بھی اپنے فرینڈز کو الوائیٹ کر لوں۔“

”او۔۔۔ آئی سی افطار۔ یومین وہ جو تم لوگ اس پورے مینے میں بھوکے پیاسے رہتے ہو“ اسی کو افطار کہتے ہیں ناں؟“

”جیہیں۔ اس کو رمضان کہتے ہیں۔ سارا دن روزے میں رہنے کے بعد شام کو جب ہم کچھ کھاتے ہیں اسے افطار کہتے ہیں۔“ نیلم نے تصحیح کی۔

”تو اس کے لیے تمہارے جی جاجی کو اتنی بڑی پارٹی دینے کی کیا ضرورت تھی؟ مذہب کو ڈھنڈورا بنانے کے پینٹا کوئی اچھی بات تو نہیں۔“ راجھا نے شاید سارہ کے اس دن والے لیکچر کا اثر تھا سارہ نے اسے شاباشی دیتی نظروں سے دیکھا۔

”اس میں ڈھنڈورا پیٹنے والی تو کوئی بات نہیں مس راجھا!“ منصف سے رہانہ گیا۔ ”پارٹیز تو ہوتی ہی رہتی ہیں اور پارٹی کے لیے کسی نہ کسی بہانے کا ہونا ضروری



کے ہوتی ہے۔ تم بھی جانتی ہو کہ یہ محض پروپیگنڈہ ہے، صرف اس بات کو بنیاد بنا کر کہ اسلام میں مرد کو چار بیویاں رکھنے کی ایک خاص حالت میں اجازت ہے۔ اس بات کو غلط طریقے سے پھیلا یا جاتا ہے۔“

”اربا ز کا کہنا درست ہے، پاکستان میں بمشکل دو یا تین فی صد ایسے لوگ ہوں گے جن کی ایک وقت میں دو سے زیادہ بیویاں ہیں اور یہ بھی وہ لوگ ہیں جن کا تعلق دیہاتوں سے ہے یا خاندانی مسائل اور ورثاتی جھگڑے انہیں ایسا کرنے پہ مجبور کرتے ہیں۔ اولاد یا اولاد زینہ کے لیے دوسری شادی کرتے ہیں ورنہ پاکستان کا عام شہری ایک بیوی اور اس کے اخراجات ہی بمشکل اٹھانے کے قابل ہوتا ہے۔“

”یعنی اگر وہ اخراجات اٹھانے کے قابل ہو تو وہ ایسا کرنے کے لیے آزاد ہے؟“

”ہاں۔۔۔“ منصف نے بغیر ہچکچائے جواب دیا۔ ”یہی تو میں کہہ رہی تھی۔ ایک عورت کی کس قدر تذلیل ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کی موجودگی میں ایک دوسری عورت سے وہی رشتہ رکھا جائے جس کا حق صرف اسے ہے۔“

”اگر بات صرف رشتے کی ہے تو یہاں کتنے شادی شدہ مرد ہیں جو گھر میں بیوی ہونے کے باوجود باہر دوسری عورتوں سے تعلقات نہیں رکھتے! فرق صرف اتنا ہے کہ امریکہ اور دوسرے ایسے ملکوں میں بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری بیوی رکھنے کی قانوناً اجازت نہیں البتہ گرل فرینڈز کی تعداد پہ پابندی نہیں نہ ہی پیشہ ور عورتوں کی خدمات حاصل کرنے کی ممانعت ہے۔ کیا یہ ایک بیوی کی تذلیل نہیں۔ مردوں کی کیا بات کریں۔ عورتیں خود کئی کئی بچوں کی ماں ہونے کے باوجود محض ٹائم پاس کے لیے خود سے عمر میں چھوٹے بوائے فرینڈز رکھتی ہیں۔“

”تم جو بھی کو مگر مسلم مرد بیویاں پالنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ میں کسی دوسرے کا نام نہیں لیتی اپنے پیار کی بات کرتی ہوں، سیدی داؤد اطرالہ کی۔ میری ماما سے ڈائی ورس ہونے کے صرف دو ہفتے بعد انہیں نے

ہے۔ جب ہم اپنی دوسری یا تیسری بیوی جیسے بے حد پرسنل ایونٹ پہ دنیا جہاں کو اکٹھا کر سکتے ہیں تو افطار، رمضان اور عید جیسے مواقع تو اجتماعی ہوتے ہیں۔ روزہ صرف ہمارا نہیں، پارٹی میں شامل ہمارے بیشتر دوست احباب کا بھی ہے۔ مل جل کر افطار کرنے میں کیا حرج ہے اور ہمارے مذہب میں روزہ رکھنے کا تو ثواب ہے ہی۔ ساتھ ساتھ دوسروں کو افطار کرانے کا دھرا ثواب ہے۔“

”اور تمہارے ہاں بھی تو پوجا وغیرہ پہ ایسا ہوتا ہے۔“ اربا ز الیاسی نے گھر کا بھیدی لٹکا ڈھانے والی بات پہ عمل کرتے ہوئے کہا۔

”کیا انڈیا میں درگاہاں کی پوجا، ہولی، دیوالی وغیرہ پہ پارٹیز نہیں ہوتیں؟ کیا تمہارے گھر میں ان تہواروں پہ میلے کا سا سماں نہیں ہوتا؟“

”نہیں، پورا مہینہ تو نہیں البتہ کئی برت ہوتے ضرور ہیں۔ لیکن وہ بھی سب کے لیے رکھنے ضروری نہیں جیسے درگاہاں کا برت، سنتوشی ماں کا برت، اور وہ کرواچو تھ کا برت جو صرف میری عورتیں رکھتی ہیں۔“ ”پھر تو ٹھیک ہے، ورنہ پورا مہینہ لگاتار تیس روزے رکھنا۔۔۔ او سو بورنگ اینڈ ہو ریل تم بھی روزے رکھتی ہو نیلم؟“

”میں۔۔۔ آل نہیں۔“ وہ گڑبڑا گئی۔ ”سارے نہیں، کبھی رکھ لیا، کبھی چھوڑ دیا۔“ وہ سارہ کے سامنے یونہی کنفیوز رہا کرتی تھی اسے ڈر رہتا تھا کہ اس کی کسی حرکت پہ سارہ اسے بھی دقیانوسی یا کنزرویٹیو پاکستانی نہ قرار دے دے۔

”منصف! کل سارہ نے ایک بڑے مزے کی بات بتائی کہ پاکستان میں ہر مرد کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتی ہیں، کیا واقعی تمہارے ملک میں عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے؟“ راجا کے سوال پہ اربا ز نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

”سارہ نے اگر یہ بات کہی تھی تو اسے اس کی لاعلمی قرار دیا جاسکتا ہے لیکن راجا! ہمیں تو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ ہمارے زیادہ ہمارے کے گھر کی خبر



بھی ٹوکا۔

”یہ سچ ہے، ہم جانتے ہیں لیکن تمہیں یہ سچ کھلے عام کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنا روڈ ہونے سے پہلے یہ تو سوچ لیتے کہ آئینہ آل سارہ از اور فرینڈ۔“

”ابھی میں نے پورا سچ بولا ہی کب ہے۔ دوسری شادی کے خلاف اتنا بڑھ چڑھ کے بولنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ بہت سی صورتوں میں انسان کو کئی قباحتوں اور بے راہ روی سے بچاتی ہے اسی لیے ہمارے مذہب میں بیوہ اور مطلقہ کو جلد از جلد دوسرا نکاح کر دینے کا حکم ہے۔ یہ اپنی ماں کے تیرہ سال سے اکیلے رہنے کو بڑے نخر سے بیان کر رہی ہے جیسے یہ کوئی کارنامہ ہو حالانکہ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ ان تیرہ سالوں میں بلا مبالغہ اس کی ماں نے تیرہ بوائے فرینڈ بد لے ہوں گے، یہ اسے قبول ہے لیکن باپ کی دو ہفتے بعد کی جانے والی دوسری شادی ناقابل معافی جرم ہے۔“

”یہ مسلمان خصوصاً پاکستانی حد سے زیادہ بد تہذیب قوم ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنا ان لوگوں کو آتا ہی نہیں۔ دوسرے کے معاملوں میں دخل اندازی کرنا اور زبردستی ان پہ اپنے فرسودہ نظریات ٹھونسنا ان کی عادت ہے۔“

سارہ کے کہے الفاظ ایک بار پھر بریتی کے ذہن میں گونجے اور وہ ان پہ ایمان لے آئی۔ منصف کتنا سچ کہہ رہا تھا اور کتنا جھوٹ، یہ الگ بحث تھی لیکن اسے سارہ کے اس طرح شرمندہ ہو کے اٹھ جانے پہ حقیقتاً افسوس ہو رہا تھا۔

”نہیں، منصف کو اس طرح سب کے درمیان اسے ذلیل کرنے اور اس کی مدر کی پرسل لائف ڈسکس کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔“ بالآخر اس کے دل نے منصف کے خلاف اور سارہ کے حق میں فیصلہ سنایا اور وہ وہاں سے اٹھ گئی۔ ارباز کو دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش میں مصروف منصف نے چونک کے اسے جاتے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ چھائی حقیقی بھری الجھن کو وہ سمجھ نہ سکا۔

دوسری شادی کر لی جبکہ میری ماما پچھلے تیرہ سال سے اکیلی ہیں۔ انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔“ اس نے بتا کر فخریہ انداز میں سب کی جانب دیکھا۔ ٹیلم کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس ان دیکھی عورت پہ عقیدت کے پھول پھجھور کر ڈالے۔

”ان کے شادی نہ کرنے کی وجہ اور ہے آئسہ سارہ واؤ۔“ اس نے جان بوجھ کے اس کے نام کو اس طرح پکارا۔

”گورنمنٹ کی طرف سے بیوہ اور مطلقہ خواتین کے لیے مختص فنڈ کے نام پہ وہ گھر بیٹھے بیٹھے جو الاؤنس پچھلے بارہ سالوں سے وصول کر رہی ہیں، ان کی دوسری شادی کی وجہ سے وہ الاؤنس ملنا خود بخود بند ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے وہ جس کسی سے بھی شادی کرتیں وہ ایک عام امریکن ہی ہوتا جو بیوی کو گھر بٹھا کے اپنی محنت کی کمائی کھلانے کا ہرگز روادار نہ ہوتا خصوصاً اس صورت میں کہ اس خرچے میں اس عورت کی پہلے سے موجود ایک بیٹی بھی حصہ دار ہوتی اور خود جاب کر کے خرچا اٹھاتے ہوئے ایک میڑ عورت کھلائے جانے سے کہیں بہتر ایک مطلقہ بن کے مفت کی کھانا نہیں زیادہ بہتر ہے۔“

اس کے کڑوے سچ پہ اور سب کو تو سانپ سو گھہ ہی گیا، خود سارہ بھی دم بخود اسے کتنی ہی دیر تک دیکھے گئی۔ اس حقیقت سے اوروں کی طرح وہ بھی واقف تھی لیکن کسی کو بھی یہ امید نہ تھی کہ منصف صاف گوئی کی انتہا کرتے ہوئے سب کے درمیان بیٹھ کے یہ بات کہے گا۔ سارہ کا حیرت سے سفید پڑتا چہرہ رفتہ رفتہ پھر سے شرمندگی اور طیش کے ملے جلے جذبات کے تحت سرخ ہو گیا۔

”تم چیپ انسان۔ تمہاری گھٹیا ذہنیت اس سے زیادہ سوچ بھی نہیں سکتی۔“ اس کے پاس اس کے علاوہ کہنے کو کچھ نہ تھا اس لیے وہ اٹھ کے چلی گئی۔ رہ جانے ملامت بھری نظروں سے منصف کے مطمئن چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ لاپرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے کافی کے گھونٹ لے رہا تھا۔ ارباز نے



رہا تو خیر تھی ہی بنے سنور نے کی شوقین اور تو اور  
سارہ نے بھی اس موقع کے لیے نیلم کی پسند سے سفید  
میٹ کا شرارہ سوٹ خریدا۔ البتہ بریتی کو لباس کا  
انتخاب کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ رہا اس  
سے اصرار کر رہی تھی کہ وہ اس کی طرح کھا کھرا چولی  
پننے۔ لیکن بریتی کو اتنے ہجوم میں ایسا ڈریس پہننا  
خاصا مشکل لگ رہا تھا۔

”تو پھر تم ساڑھی پہن لو۔ اگر بنارس ساڑھی  
بھاری لگ رہی ہے تو اس طرف دیکھو، اشارہ اس کی  
ساری کو لیکشن موجود ہے، یہ تلسی کی بھارتی ساڑھیاں  
یہ کم کم کی شفون کی ساڑھیاں اور یہ پاروٹی کی۔“  
”بھئی۔ یہ ساڑھیاں وغیرہ تم کسی اور ایونٹ کے  
لیے رکھ چھوڑنا۔“ نیلم نے دخل دیا۔

”جیسے کہ میری انگیجمنٹ۔۔۔ یہ عید ہے ڈیر،  
خالص مسلم تھوار، اس میں وہ ڈریس پہن کے آؤ جیسا  
کہ مسلم ملکوں میں پہنا جاتا ہے۔ یہ دیکھو، آج تو ہماری  
فرینچ پریس نے بھی شرارہ لیا ہے۔ چلو کوئی اسٹائلش  
ساٹلوار قیص ہی لے لو۔“  
”خالص مسلم تھوار۔ عید۔۔۔ جیسا ڈریس مسلم  
ملکوں میں پہنا جاتا ہے ویسا۔“

نیلم کے الفاظ ایک بار پھر بریتی کو بھرپور طریقے سے  
احساس دلا گئے کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے۔ اس احساس  
کے ساتھ ہی وہ ایک بار پھر خوفزدہ ہو گئی۔ اپنے پیپا کے  
وہ سارے فرمودات تمام تر نفرت کے ساتھ ذہن میں  
تازہ ہو گئے جو وہ مسلمانوں کے بارے میں دہراتے  
رہتے تھے۔ لیکن وہ اس بات کا اظہار اپنی دوستوں  
بالخصوص سارہ کے سامنے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جس  
کی ہندوؤں کے بارے میں رائے مسلمانوں کے  
مقابلے میں نسبتاً بہتر تھی۔ اس کے خیال میں ہندو  
مسلمانوں سے زیادہ آزاد فکر اور روشن خیال تھے۔ وہ  
اپنے پیپا کے تعصب کا ذکر کر کے یہ ایجنڈا خراب نہیں  
کرنا چاہتی تھی۔ ان ہی متضاد سوچوں کے زیر اثر اس  
نے چپ چاپ ان تینوں کے رحم و کرم پر اپنا آپ بھوڑ  
دیا۔

اور یہ اس کے ٹھیک دس دن بعد کی بات تھی جب  
وہ ایک بار پھر رہا اور سارہ کے ساتھ شاپنگ کرنے  
آئی تھی۔ اس بار ان کے ساتھ نیلم بھی تھی۔ وہ  
چاہنے کے باوجود اس روز نیلم سرور کے ہاں افطار پارٹی  
میں نہ جاسکی تھی حالانکہ جس کی وجہ سے اس کا جی  
مکدر ہوا تھا۔ یعنی سارہ ڈیوڈ کی وجہ سے۔ وہ آرام  
سے چلی گئی تھی۔ اس عید پہ فلشنگ اور  
Park meadow میں جا کر عید فیشنول میں  
شرکت کرنے کا آئیڈیا بھی سارہ کا ہی تھا اور رہا کی  
طرح بریتی بھی دوستی کے ناتے ان کا ساتھ دینے  
مجبور تھی ویسے بھی پارٹی میں نہ آنے کی وجہ سے نیلم  
اس سے ٹھیک ٹھاک ناراض رہی تھی، اس بار وہ ان  
کے پروگرام میں شامل نہ ہو کے سب کی ناراضی  
مول لینا نہ چاہتی تھی۔

رہا کے لیے یہ فیشنول ایک رنگا رنگ اور  
دلچسپ تفریح تھی، وہ پورے جی جان سے جبکس  
ہائینس میں شاپنگ کرنے میں مصروف تھی۔

”آئی مسٹ سے پار۔۔۔ یہ امریکہ کا انارکلی بازار  
ہے۔“ نیلم سرور نے انکشاف کیا۔ جبکس ہائینس  
کے اس کارنر میں سب ہی دکانیں، انڈین اور پاکستانی  
لوگوں کی تھیں، پراندے، سندھی اور بلوچی کڑھائی  
سے مزین کرتے اور بلاؤز، بنارس ساڑھیاں،  
حیدر آبادی سوٹ، اجرک، پشاور پیچل اور اس کے  
علاوہ مختلف بوتھکس میں جدید انداز کے سلے شلوار  
سوٹ، یہ سب مکمل طور پر پاکستان کے کسی پر رونق  
بازار کا منظر پیش کر رہے تھے۔

نیلم کی تیاری سب سے الگ تھی۔ پچھلے دنوں  
ہونے والی پارٹی میں اس کی بات بھی طے ہو گئی تھی۔  
ایک اور پاکستانی ٹیلی جو عرصہ دراز سے امریکہ میں مقیم  
تھی، ان کے بزنس مین بیٹے سے۔۔۔ یہ ٹیلی بھی عید  
فیشنول کی پریڈ میں شرکت کرنے آرہی تھی، یہی وجہ  
تھی کہ نیلم کا جوش و خروش دیکھنے سے لعلق رکھتا تھا۔



”تمہیں پہلے بھی اس لباس میں کئی بار دیکھا ہے لیکن آج کے خاص دن کے حوالے سے یہ پہننا بہت ہی خاص بات لگ رہا ہے۔ اور تم واقعی ”بہت خاص“ لگ رہی ہو۔ پریتی۔“

منصف نے اسے دیکھتے ہی بے دھڑک تعریف کر ڈالی تھی وہ نموس سی ہو گئی۔ سارہ کی جانب دیکھنے سے تو اس نے شعوری طور پر یہ اجتناب کیا اس کی کن ترانیوں سے وہ ویسے ہی خائف رہا کرتی تھی۔

”لیکن مجھے تو اس ڈریس میں تم نے پہلے کبھی دیکھا تک نہیں مسٹر منصف علی تارڑ۔ پھر کیا مجھ میں کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی؟“

سارہ نے بڑے انداز سے اس کے قریب آ کے پوچھا۔ منصف نے ذرا غور سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ بلاشبہ بے حد خوب صورت تھی اور آج تو ایسے لگ رہا تھا جیسے سنڈریلا کسی فینسی ڈریس شو کے لیے مغلیہ شہزادی۔ یا انارکلی کا روپ بھر کے آئی ہو۔ سفید شرارہ جو سلور تیلے کے کام سے بھرا تھا اس کے آفت فکر پہ غضب ڈھا رہا تھا، بلونڈ بالوں کا انڈین اسٹائل کا جوڑا اس کے فریج کٹ چہرے پہ بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا۔

”ہاں واقعی، اس ایسٹرن لک میں تم بہت الگ محسوس ہو رہی ہو اور خاص بات یہ ہے کہ تمہارے چہرے کی خباثت آج غائب ہے۔“ وہ تو یہ ریمارک دے کر چلتا بنا اور سارہ دیر تک زیر لب بڑبڑا کے اسے گالیاں دیتی رہی۔

\*\*\*

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی وہاں جانے کی۔ کیا تم جانتی نہیں تھی کہ وہ لوگ کون تھے۔ کسی لیے وہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ پھر کیا سوچ کے تم نے ان میں شامل ہونے کی غلطی کی۔؟“

نجانے کیسے ڈاکٹر ابھے کو اس کے عید فیشول میں شرکت کرنے کی خبر ہو گئی۔ وہ عموماً اس وقت گھر نہیں آتا تھا لیکن آج خلاف معمول پریتی نے اسے

آتے دیکھا تو چونک اٹھی۔ اسے بھی گھر میں داخل ہوئے ابھی دو تین منٹ ہی ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ابھے نے سرخ آنکھوں کے ساتھ اس کے چیلے کا جائزہ لیا۔

بلکے بادامی رنگ کے خالص پاکستانی انداز میں سلے شلوار قمیص۔ سبز اور براؤن دھماکے کی کڑھائی تھی۔ انہی دو رنگوں کا بڑا سا دوپٹہ اس کے شانوں پہ پھیلا تھا۔ کھلے ہوئے سلکی بالوں کے ساتھ وہ خاصی حسین لگ رہی تھی اور حیرت انگیز طور پر فیلم سرور۔ یا کسی بھی اور پاکستانی لڑکی جیسی بھی۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار شلوار قمیص پہن چکی تھی۔ شاید یہ آج کے خاص دن۔ اور اس کے حوالے سے خاص طور پہ تیار ہونے کا اثر تھا۔

”اگر مکمل، اہل یا تکمیل میں سے کوئی ایسی حرکت کرتا، دکھ تو مجھے تب بھی ہوتا مگر اس کی شدت اتنی تکلیف دہ نہ ہوتی۔ اور حیرت تو ہرگز نہ ہوتی۔ لیکن تم سے۔۔۔ تم سے پریتی مجھے یہ توقع بالکل نہ تھی۔“

”لیکن بابا۔۔۔ میں تو بلیومی بابا۔۔۔ میں جانا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ وہ بس۔۔۔“ اس نے تو پہلے سے سوچ بھی نہ رکھا تھا کہ کیا بھانا بنایا جائے۔

”تو کیا تمہیں زبردستی وہاں لے جایا گیا تھا۔“ ڈاکٹر ابھے کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔ نیہانے نے مداخلت کی۔

”بس بھی کرو ابھے۔ ایک ذرا سی بات ہے اس کی جان ہی لے لو گے کیا؟ تم نے کبھی اس سے اونچی آواز تک میں بات نہیں کی اور آج۔۔۔ دیکھو اس کی رنگت کیسے زرد ہو رہی ہے۔ وہ پہلے ہی بہت خوفزدہ ہے۔“

”یہ خوف اسے تب کیوں نہ محسوس ہوا جب یہ وہاں گئی تھی۔“

”وہ کہہ تو رہی ہے، اپنی مرضی سے نہیں گئی۔ زبردستی والی تو کوئی بات نہیں لیکن کبھی کبھی کوئی کام انسان بہت مجبور ہو کے دوسروں کی وجہ سے بھی کر لیتا ہے۔ اس کے سب ہی کلاس فیلوز جارہے تھے، ان کے پریشر میں آ کے چلی گئی۔“

”تو کیا اس کے سرکل میں بھی مسلمان ہیں؟ کیا



پوچھتے ہوں گے اور اگر وہ کوئی مسلمان نکل آتا ہو گا تو ضرور اسے باہر کا راستہ دکھا دیتے ہوں گے۔  
”لی، ہیو یور سیلف پریٹی!“

”نانا! آپ لوگ انڈینز ہیں ناں۔۔۔ میں انڈیا کبھی نہیں گئی مگر سنا یہی ہے کہ وہ ایک سیکولر دیش ہے۔ کیا یہی وہ سیکولر ازم ہے؟ اگر واقعی وہاں سیکولر راج ہے تو وہاں کے رہنے والوں کے ذہن سیکولر ازم کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ ایسا شاید سب کے ساتھ نہیں ہو گا۔ آپ لوگوں کے کتنی ہی انڈین فیملیز کے ساتھ اچھے رشتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ انکل شرما کے گھر میں دو دو مسلمان سرونٹ ہیں۔ ان کا دھرم تو بھر شٹ نہیں ہوتا ان کے ہاتھ کا کھانا کھا کر۔ آئی پدما کے ہاں پارٹی پہ کتنی ہی مسلمان آئینڈ بھی تھیں۔ کوئی بھی اپنے بچوں پہ یہ روک ٹوک نہیں لگاتا کہ مسلمان سے دوستی نہیں رکھنی یا پارسی سے تعلقات نہیں بڑھانے۔ میرے بھی کئی انڈین فرینڈز ہیں، کسی کو اپنی فیملی سے ایسی روک ٹوک کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس کا مطلب ہے سب ہی ایسے متعصب نہیں۔۔۔ پھر بتا نہیں پایا کہ ایسی محدود سوچ کیوں ہے؟“  
”پریٹی!“ ڈاکٹر نینا کو واقعی حیرت ہوئی کیونکہ پریٹی ہمیشہ سے پیاز بے بی رہی تھی۔ باپ کی بہت سے باتوں سے اختلاف رکھنے کے باوجود اس نے کبھی کھل کے اس کا اظہار نہ کیا تھا اور آج اس کا رد عمل ایک نئی چیز تھی۔

”آخر سارہ بھی تو لاسٹ دیوالی پہ میرے گھر تھی۔ اس کا دھرم تو بھر شٹ نہیں ہوا سچ جلاتے اور بجھن گاتے ہوئے۔“

”اس کا تو کوئی دھرم ہے ہی نہیں اس لیے سارہ کی بات مت کرو۔ یہ بات تمہارے پیاز بھی جانتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اس کے گھر آنے پہ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا لیکن یہ نیلم۔۔۔ اور تمہارے دوسرے نئے مسلم فرینڈز۔۔۔ بتا نہیں وہ کیسے لوگ ہیں؟ تمہارے پیاز اسی لیے فکر مند ہیں، تم نہیں جانتیں، یہ مسلمان دوسروں سے دوستی بغیر کسی مطلب کے نہیں کرتے۔“

دوستی کرنے کے لیے اور کوئی نہیں رہ گیا؟ جبکہ میں نے ان چاروں کو شروع سے ہی واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ ان لوگوں سے دور ہیں۔ یہ ہماری دوستی کے قابل نہیں۔ کیا سوچ کے اس نے مسلم لڑکے لڑکیوں سے دوستی رکھی۔“

”پاپا! میرے انڈین اور امریکن فرینڈز۔۔۔ سب ہی ساتھ میں تھے۔ ان فیکٹ ہم کلاس فیلوز سب ہی تہوار ساتھ ساتھ مناتے ہیں۔ اپیشلی ایشین سرکل میں یہ بات زیادہ دیکھی گئی ہے کیونکہ ان میں زیادہ تر لوگ اپنے دیش سے دور ہوتے ہیں، انہیں ہوم سک فیل نہ ہونے پائے اس لیے ہم سب مل کے ان کی خوشی مناتے ہیں، پھر چاہے وہ ہولی ہو، دیوالی ہو، کرسمس یا ایسٹر ہو یا پھر عید۔“

”ہولی ہو۔۔۔ دیوالی ہو۔۔۔ کرسمس ہو۔۔۔ یا پھر چاہے ایسٹر ہو۔۔۔ مگر پریٹی دیون۔۔۔ عید نہیں، عید کبھی نہیں۔“ اس نے پریٹی کے نزدیک آتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ سر جھکا کے رہ گئی۔  
”یہ تمہاری پہلی غلطی تھی۔ امید ہے آخری بھی ہوگی، ورنہ آئندہ میری جانب سے کسی نرمی کی توقع مت رکھنا۔ میں تم لوگوں کو اور سب کچھ دے سکتا ہوں، ہر قسم کی آزادی، ہر طرح کی آسائش، تمام سہولتیں۔۔۔ مگر اپنا دھرم بھر شٹ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، مرتے دم تک نہیں۔“

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ڈاکٹر انجھے کو باہر نکلتا دیکھتی رہی جو شاید یہ خبر ملتے ہی صرف اسے باز پرس کرنے ہی گھر آیا تھا۔۔۔ اپنی بے شمار مصروفیات میں سے وقت نکال کر۔۔۔ اس کی برہمی کا سارا غبار پریٹی نے ماں کے سامنے نکالا۔

”آئی کانٹ انڈر اسٹینڈ کہ پیاز کبھی کبھی ایسا ہی ہو کیوں کرتے ہیں۔ کہیں اسے وہ ایک ایجوکیٹڈ، ہائی کوالٹی فامڈ ڈاکٹر نہیں لگتے۔۔۔ بلکہ کسی پرانے سے مندر کے پنڈت ہمارا ج لگتے ہیں۔ آئی سویر، وہ ہاسپٹل میں آنے والے ہر ہیشنٹ سے بھی اس کی بیماری یا تکلیف کے بارے میں پوچھنے کے بجائے اس کا دھرم



یہ جس سے بھی رابطہ بڑھاتے ہیں اس کا مقصد صرف ایک ہی ہوتا ہے یعنی اسے سچے راستے سے ہٹا کر اپنے دھرم پہ لانا۔ تمہارے فرینڈز بھی جلد ہی ایسی کوشش کریں گے۔ ابھی کو بھی یہی ڈر ہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوتا ماما! پلیز آپ تو پیلا جیسی باتیں مت کریں۔ ایک دوسرے کے تہواروں میں صرف خوشی شیر کر لینے کی غرض سے شامل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مجھے یا میں ان کو اپنے اپنے دھرم کی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نہ سارہ میرے ساتھ دیوالی مناتے ہوئے میری دیکھا دیکھی رام کے آگے ماتھا ٹیک سکتی ہے۔ غلام کا مجھ پہ ہولی کے رنگ اچھا لانا الگ بات ہے لیکن وہ میرے ساتھ گیتا کے اشلوک نہیں پڑھ سکتی۔ اسی طرح میرا اس فیشنول میں شامل ہونا جسٹ آفن تھا، میں ان کے ساتھ نماز تو نہیں پڑھنے لگی تھی نہ ہی وہ مجھے اس پر مجبور کر سکتے ہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ لہنا بالآخر بیچ ہوا تھی۔ دل سے وہ بھی اپنے پتی کی بے جا روک ٹوک سے تالاں بھی لیکن اس کی شدت پسندی، مخالفت کی وجہ سے زیادہ زور نہ پکڑ جائے اسی لیے ہر ممکن حد تک کوشش کرتے ہوئے مفاہمت کی فضا پیدا کیے رکھتی۔

”بس مجھے اتنا پتا ہے کہ ابھی کو یہ پسند نہیں۔ وہ تمہارے پتا ہیں تمہارے لیے اتنا سب کچھ کرنے کے بعد وہ صرف اتنا ہی تم سے مانگتے ہیں کہ تم ان کی پسند کے لوگوں سے ملو تو تمہیں اس کا احترام کرنا چاہیے۔“ لیکن اس کی کوئی لاجب بھی تو ہو۔

”پریتی!“ تنگ آ کے لہنا کو بھی اپنا لہجہ سخت کرنا پڑا ورنہ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ ابھی کی سخت گیری کا اثر رائل کرنے کے لیے وہ اولاد کے ساتھ اپنا رویہ زیادہ سے زیادہ دوستانہ رکھے۔ بچوں میں سب سے زیادہ ذہنی ہم آہنگی بھی اس کی پریتی کے ساتھ ہی تھی حالانکہ وہ پیلا کی لاڈلی تھی۔ لیکن آج پہلی بار وہ پریتی کا بدلا ہوا رویہ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی لہنا کی طرح مفاہمانہ رویہ رکھتے ہوئے ڈاکٹر ابھی کی ہر پسند ناپسند پہ بلا جوں و چرا عمل کیا کرتی تھی۔ یہ باغیانہ تبدیلی اس میں کب

اور کیسے آئی یہ اسے پتا ہی نہ چلا۔ خود پریتی بھی اپنی سوچ کے اس نئے رخ کے بارے میں لاعلم تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں ماما! اپنے دھرم پہ کٹر رہنا۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ اگر پیلا دوسرے تمام دھرم کے لوگوں سے مجھے الگ رہنے کا حکم دیں تب بھی یہ بات ٹھیک لگتی ہے کہ وہ اپنے دھرم کے علاوہ دوسرے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ یا انہیں ڈر ہے کہ ان کے بچے کسی دوسرے دھرم کا اثر نہ قبول کر لیں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان کے سرکل میں کرسمس فرینڈز ہو سکتے ہیں تو مسلم کیوں نہیں۔ وہ اور ان کے بچے کرسمس اپنے فرینڈز کے ساتھ سیلبوٹ کر سکتے ہیں تو عید کیوں نہیں۔ مکمل نیو اور نائنٹ پہ اپنے امریکن فرینڈز کے ساتھ انجوائے منٹ کے نام پہ جوا بازی کرتا ہے، وہ ٹھیک ہے لیکن میرا اس سادہ سے تہوار میں بے ضرر سا شامل ہو جانا غلط ہے۔

مکمل کے بارے میں اگر پیلا کو علم ہوتا ہے کہ وہ کل رات ڈرنک کر کے آیا تھا تو وہ ہلکی سی سرزلش کر کے چھوڑ دیتے ہیں لیکن امل کے بارے میں خبر ملتی ہے کہ وہ ایک مسلم ریسٹورانٹ میں بریانی اور چکن تندوری کھا کے آیا ہے تو پیلا اسے سب کے سامنے پھٹکار دیتے ہیں۔ یہ ڈبل اسٹینڈرڈ تھوکنگ نہیں تو اور کیا ہے۔ سارہ اور راجا جب ویلنٹائن پارٹی میں مجھے ساتھ لے جانے کے لیے پیلا سے پریشانی لینے آئی تھیں تب مجھے ایک پرمسٹ بھی امید نہ تھی پیلا کے ماننے کی۔ لیکن انہوں نے پریشانی دے دی۔ ویلنٹائن کیا ہے؟ کیا یہ

ہمارے دھرم میں ہے؟ نہیں ناں پھر ہم اسے سیلبوٹ کیوں کرتے ہیں؟ کیوں پیلا آپ کے لیے گلاب لاتے ہیں اور کیوں آپ پیلا کو کارڈ دیتی ہیں۔ اسی لیے ناں کہ ان باتوں سے آپ کے دھرم پہ کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح عید فیشنول پہ جانا بھی میرے لیے میرے فرینڈز کے ساتھ ایک پارٹی میں جانے سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ اس سے دھرم تو کیا، میرے کلچر اور ویلیوز تک میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ لوگ بہت سی باتوں میں ہمارے جیسے ہیں اپیشلی پاکستانی



مسلمان ان سے میں کوئی بری بات کیسے سیکھ سکتی ہوں؟

”تو کیا تمہارے سامان غلط کہتے ہیں؟“

”لیس“ ہی از رائگ۔ اس نے بلا توقف کہا۔  
 ”ٹوٹلی رائگ“ پہلے میں بھی آنکھیں بند کر کے ان کی ہر بات مان لیا کرتی تھی چاہے وہ میری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ پہلے پہل جب انہوں نے مجھ پر روزی، ڈورا اور سامان تھا سے زیادہ ملنے اور اپیشلی آن کے گھروں میں جانے پر پابندی لگائی تو یہ بات بھی میری سمجھ میں نہ آئی تھی شاید اس لیے کہ تب میں صرف دس سال کی تھی لیکن جلد ہی میں اس کی وجہ جان گئی۔ جب ایک دو سالوں بعد ہی میں نے دیکھا کہ وہ اب تک منی اسکرٹس پہن رہی ہیں جب کہ میری ڈریسنگ چیئنج ہو چکی تھی۔ مین ایج کے اشارت میں ہی انہوں نے ڈیٹ پہ جانا، ڈسکو میں وقت گزارنا اور ڈرنکس لینا شروع کر دیا تھا تب میں اپنے اور ان کے درمیان فرق کو جان پائی اور یہ بھی کہ مجھے ان سے دور رکھنے کی وجہ کیا تھی۔ بہت سی انڈین فیمیلز جنہوں نے یہ تکلف نہیں کیا، آج ان کی نیو جنریشن بالکل امریکہ کے رنگ میں رنگ چکی ہے۔ اپنا کچر اور پہچان بھول چکی ہے، صرف ہم اور ہمارے جیسے دوسرے لوگ اپنی پہچان باقی رکھ پائے ہیں اور ایسے میں میں اپنی پاکستانی فرینڈز کے ساتھ زیادہ اچھا محسوس کرتی ہوں کیونکہ ان کی اقدار بالکل ہمارے جیسی ہیں۔ یہی وجہ ہے میرے ان سے قریب ہونے کی۔“

”آج تمہیں ان کی بہت سی باتیں اچھی لگ رہی ہیں۔ کل کو ان کا دھرم بھی اچھا لگنے لگے گا۔“  
 ”ان کی بہت سی باتیں مجھے اس لیے اچھی لگتی ہیں ماما! کہ میں ان بہت سی باتوں کے بارے میں جاننے لگی ہوں اور وہ بالکل ہمارے جیسی ہیں لیکن ان کے دھرم کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتی نہ ہی وہ ہمارے جیسا ہو گا، پھر آپ کو ڈر کس بات کا ہے؟ آپ اور پاپا خود کو اتنا غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔“  
 ”تم سے کس نے کہا کہ ہم خود کو غیر محفوظ سمجھتے

ہیں۔“

ڈاکٹر نہینا کی آواز بلند ہو گئی۔ ”تمہیں محفوظ رکھنے کی کوششوں کا مطلب یہ ہے کہ تم اب ہم پر ایسے الزام لگاؤ گی۔“

”لیکن آپ ہم لوگوں کو کس سے محفوظ رکھنا چاہتی ہیں۔۔۔ ہم یہاں کے مقامی لوگوں سے تعلقات قائم نہیں کر سکتے کہ وہ ہم سے یکسر مختلف ہیں۔ آزاد ہیں بے راہ رو ہیں۔ لیکن جن کا کچر اور مورل ویلیوز ہم سے میل کاتی ہیں، ان سے بھی ہم نہیں مل سکتے کہ آپ کو ہمارے دھرم بھر شٹ ہونے کا خطرہ ہے۔ فار گاڈ سیک ماما، کوئی یونہی اپنے دھرم سے نہیں پھر جاتا۔“

”بکھی بکھی ایسا بھی ہو جایا کرتا ہے پریتی! تم ان مسلمانوں کو نہیں جانتیں۔ یہ دوسرے کو بھلا پھسلا کے اس حد تک مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ۔۔۔“

”او کم آن ماما! میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں بلکہ کوئی بھی شخص شخص کسی کے بھلانے پھسلانے میں آکے اپنا دھرم نہیں بدلتا۔ ہاں اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ ہوتی ہوگی۔ میرے پاس ایسی کوئی وجہ نہیں۔ میں اپنے دھرم اور سنسکاروں سے پوری طرح مطمئن ہوں، اتنی ہی جتنی کہ آپ اور پاپا۔ آپ بتائیے کہ کیا آپ کے پاس کبھی اپنا دھرم بدلنے کی کوئی وجہ ہوگی؟“

”شٹ اپ پریتی!“ آخر نہینا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا حالانکہ وہ بڑی متحمل مزاج عورت تھی۔ پریتی کو بھی احساس ہوا کہ وہ آج ضرورت سے زیادہ ہی بول رہی ہے۔

”فار گیٹ اٹ ماما! پتہ نہیں ہم یہ بے کار کی بحث کیوں کر رہے ہیں۔ آئی ایم ساری اگر میں نے کچھ ایسا کہہ دیا ہو جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ ان لیکچر میں آپ کو صرف یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ اپنے اتنے سالوں کی تربیت پر آپ کو اور پاپا کو اعتماد ہونا چاہیے۔ آپ نے ہمیں ان کی پکڑ کے چلنا سکھایا ہے۔ ہم اب اس عمر تک آگئے ہیں جب آپ کے بتائے رستے پہ خود بخود



و خروش بھر دیا تھا۔ وہ واحد تھی پورے گروپ میں جو  
انگلیچ ہونے جا رہی تھی۔  
”تم تینوں مہمانوں کی طرح عین وقت پہ ہرگز نہیں  
آؤ گی۔ تمہیں صبح ہی آنا ہو گا اور سارا دن میرے ساتھ  
گزارنا ہو گا“ ریکی۔ میں ابھی سے بہت نروس ہو رہی  
ہوں۔“

”ڈونٹ وری یار! ہم تینوں ہی تمہیں صبح آ کے  
جگا میں گے۔ بلکہ میں تو پار لر بھی تمہارے ساتھ ہی  
جاؤں گی۔“ رہ جانے انہی اضافی خدمات پیش کیں اور  
پریتی سوچ میں پڑ گئی کہ ابھی تو عید والا واقعہ ٹھنڈا نہیں  
ہوا، وہ گھر میں اس ممکنہ نہ جانے کا ذکر شروع کر کے  
کیس پھر سے یہ تنازعہ نہ چھیڑ دے۔ لیکن ذکر تو اسے  
کرنا ہی تھا، اس کے بغیر اجازت ملنا مشکل ہوتا۔ بہت  
غور کرنے کے بعد اس نے پہلے ماں سے بات کی۔ ڈاکٹر  
نینا اس کا مدعا جان کر ایک گہری سانس بھر کے رہ گئی۔  
”پھر وہی بات پریتی! تم کب مجھو گی کہ۔۔۔  
فارگیٹ اٹ بے بی! ابھی کبھی اس کی بریشن نہیں  
دے گا اور عید والے واقعے کے بعد تو ہرگز نہیں۔“  
”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم انہیں نیلم کے بارے  
میں نہ بتائیں۔“ اس تجویز پہ نینا نے پلٹ کے اسے  
ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرمندہ ہو گئی۔

”آئی مین انہیں صرف یہ بتایا جائے کہ میں اپنی  
کسی ایکس والی زید فرینڈ کی اینگجمنٹ میں جا رہی  
ہوں۔“

”اس ایکس والی زید کا نام تو ابھی ضرور جانتا چاہے  
گا۔ وہ اب اور بھی محتاط ہو چکا ہے۔ پہلے وہ تم یہ  
آنکھیں بند کر کے اعتماد کرتا تھا۔ اب مکمل اور  
نکمل کی طرح وہ تم پہ بھی نظر رکھنے لگا ہے۔ اس لیے  
تم اپنے پیلا کو دھوکا دینے کا خیال دل سے نکال دو۔“

”بلیومی“ میں انہیں دھوکا نہیں دینا چاہتی۔ ہاں میں  
ایک جھوٹ بول رہی ہوں لیکن آپ کو بتا کر۔۔۔ میں  
کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ بھاگ نہیں رہی۔ اپنی  
ایک فرینڈ کی خوشی میں شامل ہونا چاہتی ہوں تاکہ اس  
کا دل نہ ٹوٹے۔ پلیز ماما! یہ میری عزت کا بھی سوال

آگے بڑھ سکیں۔ اس کے بعد بھی اگر آپ سمجھتے ہیں  
کہ ہم میں اچھے اور برے کی تمیز نہیں رہی اور کوئی  
بھی با آسانی آپ کے بچوں کو ورغلا سکتا ہے تو پلیز  
میری آپ دونوں سے ریکوسٹ ہے کہ آپ ہمیں  
لے کر سال مت رہیں۔“  
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ کہ ایک ایسی جگہ ایسا ملک جہاں ہر  
جانب سے ہمارے دھرم اور ریت رواج کو ٹھیس پہنچنے  
کا خطرہ ہو، وہاں رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔  
نیویارک کے اس کونے میں اپنا الگ بھارت بنانے  
کے بجائے ہم بھارت ہی کیوں نہیں چلے جاتے۔“  
”فضول باتیں مت کرو پریتی!“ ڈاکٹر نینا کے  
چہرے کی رنگت ایک دم متغیر ہوئی۔

”کمال ہے اپنی جنم بھومی جانے کی بات کرنا فضول  
ہے۔“ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ مکمل طور پہ  
بھارتی ماحول اور سوچ رکھنے والے اس کے ماما پاپا نے  
دیش بھارت جانے کے نام سے ہچکچاتے کیوں ہیں۔  
”بھارت تمہاری جنم بھومی نہیں ہے۔“ نینا نے  
جلد ہی خود پہ کنٹرول کیا۔

”مسواٹ“ آپ کی تو ہے ہمارے پرکھوں کی تو  
ہے۔“

”اب وہاں ہمارا کوئی نہیں رہا۔“ اس کی آواز میں  
ملال گھل گیا۔

”یہاں بھی تو ہمارا کوئی نہیں۔ ہاں دوست ہیں تو  
دوست تو وہاں جا کے بھی بنائے جاسکتے ہیں۔“

”پریتی! تم اتنی کج بحث اور ضدی کیوں ہو گئی ہو۔  
پہلے تو ایسی نہ تھیں۔“ وہ بے بسی سے کہہ اٹھی تو پریتی  
حقیقتاً ”شرمسار ہو کر چپ ہو گئی۔“

\*\*\*

”نیلم کے لیے تو اس کے جی جی کی پارٹی بڑی  
بھاگو ان رہی۔“

رہ جانے تبصرہ کیا۔ عید کے اگلے ہی ہفتے نیلم کی  
ممكنی طے ہو جانے کی خبر نے سارے گروپ میں جوش



ہے۔ ہمارا سارا گروپ وہاں ہو گا۔ میں اپنے نہ ہونے کا کیا ریزن بتاؤں گی۔ آئی پراس 'اس کے بعد میں آہستہ آہستہ پیلا کی خواہش کے مطابق اپنے مسلم فرنڈز سے کم سے کم تعلق رکھنا شروع کر دوں گی۔ اب ایک دم سے کیسے۔۔۔ وہ کیا سوچیں گے۔ ویسے بھی یہ میرا لاسٹ سمسٹر ہے۔ اس کے بعد ہم کہاں۔۔۔ وہ کہاں۔۔۔

”اوکے، آئی دل ٹرائی۔“ ناچار نیننا نے اس کی مدد کا وعدہ کر لیا۔

”تمہاری دوست کی منگنی؟“ ڈاکٹر ابھے حیرت سے کہہ کے رہ گیا۔ اس کا نوالہ بناتا ہاتھ بھی وہیں رک گیا۔ ڈاکٹر نیننا نے اچھٹے سے اس کا رد عمل دیکھا۔

”اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے، کیا لڑکیوں کی منگنی نہیں ہوا کرتی۔۔۔ یا پھر پریتی کی کسی دوست کی منگنی نہیں ہو سکتی؟“

”میں حیران اس بات پہ ہوں کہ ہماری پریتی اب اتنی بڑی ہو گئی۔ کل تک اس کی فرنڈز کی برتھ ڈے پارٹیز ہوا کرتی تھیں جن میں جانے کی یہ پریشانی گرتی تھی اور آج۔۔۔ منگنی۔۔۔ کل شادی۔“ وہ خوش دلی سے ہنس دیا۔

”اس کا مطلب ہے اب ہماری پریتی بھی بیاہ کے لائق ہو گئی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے نیننا کی جانب دیکھا۔ اس نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ پریتی کو نجانے کیوں دونوں کی مسکراہٹ سے الجھن سی محسوس ہوئی۔

”پلیز پیلا! بتائیے ناں۔۔۔ میں چلی جاؤں، اس نے مجھے پورے دن کے لیے بلایا ہے۔“ وہ اندر ہی اندر ڈر بھی رہی تھی کہ پیلا اس سہیلی کا نام نہ پوچھ لیں۔ اگرچہ وہ جھوٹ بولنے کا ارادہ کر چکی تھی اور دل میں ایک خالص ہندوستانی نام بھی سوچ رکھا تھا پھر بھی اندر کا چور گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ لیکن ابھے کا دھیان بٹ چکا تھا۔ وہ نئے نئے سوچے اس خیال سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”یعنی اب ہماری راتوں کی نیند بھی اڑ جانی

چاہیے۔ کیوں نیننا! کیا خیال ہے؟۔۔۔ تیاری کریں کیا دان کی؟“

”بڑی دیر سے خیال آیا تمہیں ابھی۔۔۔ ورنہ میں تو بہت پہلے سے اس بارے میں فکر مند تھی۔ دراصل تم نے پریتی کو ہمیشہ سے ایک بچی کی طرح ٹریٹ کیا ہے اس لیے تمہیں یہ حقیقت جاننے میں کچھ وقت لگا۔“

”ہاں شاید اور اب بھی یہ خیال آتے ہی میرے دل کو کچھ ہونے لگا ہے۔“ وہ اداس ہونے لگا۔ تو مکمل نے ماحول کو خوشگوار کرنا چاہا۔

”کم آن پیلا! ہم پریتی کی برائی نہیں کریں گے، اس کے لیے گھر جمائی ڈھونڈ لیتے ہیں۔“

”آف کورس، آخر ہماری ایک ہی تو بہن ہے۔“ نکھل نے بھی تائید کی۔

”پلیز اسٹاپ اٹ، میں کیا بات کرنے آئی تھی، اور آپ سب نے یہ کیا ذکر چھیڑ دیا۔“ پریتی جھنجھلا گئی۔ ”مت تنگ کرو میری بیٹی کو۔“ نیننا نے بیٹوں کو سرزنش کی۔

”اوکے پیلا، یوے گو۔۔۔“ یا تو ابھے واقعی کچھ روز پہلے والی پریتی کی غلطی معاف کر چکا تھا یا اس گفتگو نے اسے بھلا دیا تھا۔

”اوہ ٹھیکس پیلا!“ اس کے ٹیبل سے اٹھ کے جانے کے بعد نیننا نے پھر سے وہی موضوع چھیڑ دیا۔ ”شکر ہے بھگوان کا، تمہیں بھی بیٹی کے جوان ہونے کا احساس ہوا۔ اب کم از کم میں اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں اکیلی نہیں ہوں۔“

”گڈ گاڈ۔۔۔ ماما نے تو ٹھیک کل انڈین فلز کی لاجپات اور بے بس ماؤں والے ڈائیسلاگ بولنے شروع کر دیے ہیں۔“ اس کے بیٹے اکناہٹ کا اظہار کرتے پریتی کے پیچھے ہی باہر نکل گئے۔

”اس میں اتنا زیادہ فکر مند ہونے والی کون سی بات ہے نیننا؟“

”بیٹی کا معاملہ ہے ابھے اور ہم اپنے دلش سے بہت دور اپنا ایک الگ سنسار بنانے بیٹھے ہیں۔ نہ یہ دلش ہمارا ہے نہ یہ سماج۔ رشتہ ڈھونڈنے نکلے تو پتا چلے گا



ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں۔ اگر ہم آج ہندوستان میں ہوتے تو یہی کام بے حد آسان ہوتا۔  
 ”ہاں۔۔۔ لیکن اگر ہوتے تو۔۔۔“ ساری بات اس اگر ہی کی تو ہے شرمیلی جی۔“ وہ اس ہو گیا۔ نہنا جانتی تھی کہ ہندوستان کا ذکر اسے دکھی کر دیتا ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ اس ذکر سے پرہیز ہی کیا کرتی تھی لیکن آج جان بوجھ کر اس نے یہ ذکر چھیڑا تھا اور ابھی کی اداسی بھی اسے اس سے باز نہ رکھ سکی۔

”یہ“ ”اگر“ بھگوان نے ہمارے نصیب میں لکھ تو نہیں دیا ابھی! ہم چاہیں تو اسے مٹا سکتے ہیں۔ ہم بھارت واپس جاسکتے ہیں۔“  
 ”بے وقوفی کی باتیں مت کرو نہنا!“ اس نے فوراً اسے جھڑک دیا۔

”سب کچھ جاننے کے باوجود تم ایسی تجویز کیسے پیش کر سکتی ہو۔ یہ ناممکن ہے۔“  
 ”کوئی ناممکن نہیں ہے، ہاں مشکل ضرور لگ رہا ہے ہمیں۔ ظاہر ہے اتنے سال یہاں ایک الگ جیون بنانے کے بعد اپنے اصل کی جانب لوٹنا مشکل تو ہے ہی۔ لیکن اصل کو بھلایا بھی تو نہیں جاسکتا۔ اصل کی جانب لوٹنے میں ہی مکتی ہے اور ہمارا اصل ہمارا اپنا دیش ہے ہمارا بھارت ہے۔“

”بھارت میرے دل میں بستا ہے لیکن میں بھارت میں بس نہیں سکتا۔“ وہ قطعیت سے کہہ رہا تھا۔  
 ”اب وہاں رہا ہی کون ہے۔“ نہنا کے لہجے میں بھی ملال اتر آیا۔

”اسی لیے تو۔۔۔ اس لیے تو نہیں جاسکتا گنگا میں ان کی استھیاں تک بہانے کا ثواب تو کما نہیں سکا اب کس منہ سے وہاں جاؤں۔“

”اپنی سنتان کے لیے، اپنے بچوں کے لیے۔ یہاں ان کا کوئی مستقبل نہیں۔ مکمل اور نکھل ہاتھ سے نکلے جارہے ہیں، جب تک ہمارے بس میں تھا ان کو کسی طرح قابو میں رکھا اب ان کی عمر ایسی نہیں کہ وہ ہماری روک ٹوک میں آئیں۔ وہاں جائیں گے تو شاید ماحول کی تبدیلی انہیں مزید بگڑنے کا موقع نہ دے۔“

کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔  
 ”ہماری پریتی میں کس بات کی کمی ہے وہ سندر ہے پڑھی لکھی ہے، اچھے پرپوارے ہے۔“

”کی ہماری پریتی میں نہیں ہے، کمی اچھے لڑکوں کی ہے۔ آج اگر ہم اپنے دیش میں ہوتے، اپنی ذات برادری کے بیچ۔۔۔ اپنے پرپوارے کے ساتھ۔۔۔ تو یہی کام جو آج مشکل لگ رہا ہے، کتنا آسان ہوتا۔ تم خود سوچو۔۔۔ یہاں کتنے ہندوستانی پرپوارے ہیں۔۔۔؟ اور ان میں سے کتنوں کو ہم جانتے ہیں؟۔۔۔ اور جن کو ہم جانتے ہیں ان میں سے کتنے ہماری ذات کے ہیں؟ کیونکہ تم برہمن ذات کے علاوہ تو کسی کو جمانی نہیں بناؤ گے اور اگر بھگوان کی کریا سے ایسا پرپوار مل بھی گیا تو پتا نہیں لڑکا کیسا ہو۔۔۔ ضروری تو نہیں کہ وہ برہمن ہیں تو ہماری طرح انہوں نے بھی امریکہ میں رہتے ہوئے اپنے سنسکاروں اور ریت رواجوں کو باقی رکھا ہو۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہاں بسنے والے ہندوستانی اپنا دیش اور سنسکرتی تو ایک طرف، دھرم تک کو بھلا چکے ہیں۔ جس بیٹی کو تم نے بائیس تیس سال تک دھرم کا پالن کرنا سکھایا ہو، اچھے سنسکار دیے ہوں اور پھر اتنی محنت سے ان پر قائم رہنا سکھایا ہو، کیا اسے ایسے گھر میں دے دو گے؟“

”کتنی تو تم ٹھیک ہو۔“ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔  
 ”سب ہی لوگ ماس کھاتے ہیں، مٹن، چکن سب چلتا ہے ان نام۔۔۔ برہمنوں کے گھر میں، ان کی نئی نسل پوجا سے کوسوں دور ہے اور تو اور انہیں گانتھوی منتر تک نہیں آتا اور ہماری پریتی۔۔۔ گیتا کے سارے اشلوک کس مددھرتا سے گائی ہے۔۔۔ میں اپنی ایسی ہیرا سی بیٹی ایسے لوگوں میں تو دوں گا بھی نہیں۔ لیکن کوئی تو ہو گا ایسا جسے بھگوان نے خاص ہماری بیٹی کے لیے بنا رکھا ہو گا، اتنے بڑے اور رنگارنگ دیش میں کیا ایسا ایک بھی نوجوان نہ ہو گا نہنا! جو ہماری پریتی کے لائق ہو؟“

”کیوں نہیں ضرور ہو گا، ہو بھی سکتا ہے۔ لیکن اتنے بڑے اور رنگارنگ دیش میں اس کیلئے نوجوان کو



کے کارن۔۔۔ پریم تمہارے نزدیک پاپ بن کے رہ گیا ہے، کاش تم مجھ سے پریم نہ کرتے، کاش تم یہ پاپ نہ کرتے۔“

”اما! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ پرتی جواب بھی ابھی اس سے کوئی بات کرنے اپنے کمرے سے دوبارہ وہاں آئی تھی اس کی خود کلامی سن کے چونک اٹھی۔

”آل، کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں۔“ اپنے دھیان میں کھوئی فیما گھبرا گئی۔

”پلیز اما! آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ کیا پاپ کون سا پاپ؟ آپ اپنے آپ کو دوش کیوں دے رہی تھیں؟ کیوں اپنے اور پاپا کے پریم کو غلطی کہہ رہی تھیں؟“

”پریم غلط نہیں ہوتا پرتی! نہ ہم نے اک دو بجے سے پریم کر کے غلطی کی تھی ہاں، ہم نے اس پریم کا جو من چاہا انجام کیا تھا، وہ ہمیں سماج کی نظر میں پاپی ضرور بنا گیا۔“

”مگر کیسے؟۔۔۔ مجھ سے اب تو کچھ نہ چھپائیں، میں اب بچی نہیں رہی۔ بچپن سے دیکھ رہی ہوں کہ اندیا جانے کے نام پہ آپ اور پاپا گھبرا جاتے ہیں، جب بھی آپ سے کچھ پوچھنا چاہیں اپنے داوا داوی۔۔۔ نانا نانی کے بارے میں تو ہمیں ٹال دیا جاتا ہے اور تو اور پاپا اپنی ویڈنگ اپنی ور سری تک منانا اچھا نہیں جانتے، اگر انہیں وش کیا جائے تو غصہ ہو جاتے ہیں۔۔۔ کیوں، کس لیے؟“

”اپنے اندر کے گلٹ سے خود ہی گھبرایا رہتا ہے ابھے، اس نے مجھ سے بیاہ اپنے پرپوار کی مرضی کے خلاف کیا تھا۔ ہماری ذات ایک نہیں تھی، وہ برہمن اور ہم پنجابی۔ برہمن صرف برہمنوں سے ہی بیاہ کرتے ہیں، صرف ذات ہی نہیں، ہماری زبان، رہن سہن، ریت رواج سب اک دوسرے سے الگ تھا۔ وہ ناگ پور میں رہا کرتے تھے، لیکن تھے بکے مہاراشٹرین۔۔۔ ایسے میں ایک پنجابی کی لڑکی کیسے بیاہ لاتے، جو شدھ برہمن بھی نہیں تھی۔ لیکن ابھے اڑ گیا، اس وقت اپنے عشق میں پاگل بھوکے اس نے مانتا پتا کو ناراض کر

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ وہاں بھی یہی مسئلہ ہے جو ان بچوں کے ساتھ۔ جن کو ہاتھ سے لکھنا ہوتا ہے، وہ نکل ہی جاتے ہیں۔ روک ٹوک تو اب کسی دلش کے نوجوان بھی برداشت نہیں کرتے۔“ وہ کسی طور نہ مان رہا تھا۔

”اچھا تو چلو پرتی کے لیے ہی سہی۔ اس کا بیاہ کرنے کے لیے ہمیشہ کے لیے نہیں تو چند سال یا چند مہینوں کے لیے یا تب تک کے لیے جب تک پرتی کے لیے کوئی اچھا بر نہیں مل جاتا۔ اس کا کنیا دان کر کے ہم واپس امریکہ لوٹ آئیں گے۔“

”مجھے ایک کوشش تو کرنے دو فیما! یہاں رشتوں کا ایسا کال بھی نہیں پڑا۔ میرے بہت سے جاننے والے ہیں، یہاں نیویارک میں بھی، فلوریڈا اور کینیڈا تک میں، کہیں نہ کہیں بات بن ہی جائے گی اور اس سے پہلے تمہیں یہ کرنا ہے کہ ایک بار پرتی سے بات کر لو، شاید وہ کسی کو پسند کر لیتی ہو۔“

”اگر ایسا ہوا تو کیا تم اس کی پسند سے اس کی شادی کرو گے؟“ وہ مسکرائی۔

”ہاں، اگر اس کی پسند میری پسند کے مطابق ہوئی تو۔۔۔“ اس نے انگلی اٹھاتے ہوئے گویا تشبیہ کی۔

”میں پریم کے خلاف نہیں ہوں، یہ تم اچھی طرح جانتی ہو، آخر ہماری بھی تو لو میرج ہے۔“

”اور ہماری پسند بھی تو تمہارے ماتا پتا کی پسند کے مطابق نہیں تھی۔“ وہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔ اس بات پہ ابھے نے اسے جن نظروں سے دیکھا۔ وہ بری طرح نادام ہو گئی۔

”سوری، میرا کہنے کا مطلب۔۔۔“

”اٹس اوکے۔“ وہ فوراً وہاں سے اٹھ گیا۔ فیما دیر تک اس کے کمرے کے بند دروازے کی جانب سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔

”پریم اتنا بڑا جرم بھی نہیں ابھے! جس کے لیے تم اتنے سالوں سے خود کو سزا دیتے آرہے ہو۔ ایشور تمہارے حال پہ رحم کرے، تمہیں اس گلٹ سے مکتی دے۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنا آپ مجرم لگتا ہے جس



کیا تھا۔ آپ پاپا کو سمجھائیں کہ ماما پتا ہمیشہ سنتان (اولاد) سے خفا نہیں رہ سکتے، جیون میں وہ بھلے ان سے ناراض رہے ہوں، مگر اپنی ذہنتہ کے ساتھ ہی وہ شانت ہو گئے ہوں گے اور ضرور آج بھی سورگ میں بیٹھے ان کے لیے، آپ کے لیے اور میرے لیے پرار تھنا کرتے ہوں گے، ان کے آشیر واد آج بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔“

”میں کوشش تو کرتی ہوں لیکن ابھی نہیں مانتا۔ اس کا خیال ہے کہ اس نے نہ صرف اپنی قسمت سے بلکہ اپنی سنتان کی قسمت سے بھی، اپنے ماما پتا کا آشیر واد نکال دیا ہے۔ یہ شرمندگی اسے اپنی جنم بھوی جانے سے روکتی ہے۔ ورنہ میری تو بڑی اچھا (خواہش) تھی کہ تمہارا بیابہ ہندوستان میں ہوتا، وہاں کے کسی سندر سے نوجوان سے۔“

”یہ میرے بیابہ کا ذکر آج کل گھوم پھر کے بار بار کیوں آجاتا ہے؟“ وہ آکتا کے بولی۔  
”کیونکہ یہ سہے کا تقاضا ہے۔ اب تمہاری بیابہ کی عمر ہو گئی ہے۔“ نینا نے پیار سے اس کے بکھرے بال سمیٹتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اب دن رات آپ یہی بات کر کر کے میرے کان پکادیں۔“

”صرف بات نہیں، میں اس بات پر عمل کرنا چاہتی ہوں۔ میری اور ابھی کی پوری کوشش ہے کہ اس سال کے آخر تک تمہاری کہیں بات پکی کر دی جائے۔ اب ہم تمہارا کنیادان کرنا چاہتے ہیں۔“

”مائی گاڈ، کیا پلاننگ ہے اور وہ بھی آج کے آج مکمل بھی ہو گئی، امیزنگ، ناشتے کی ٹیبل پہ ناشتہ پورا ہونے سے پہلے پہلے آپ نے میرے بیابہ کے بارے میں سب فاسٹل بھی کر لیا؟“

”ہگلی، کیا فاسٹل کیا ہے؟ دو لہا ہے نہیں، بات آئی نہیں، ابھی تو لڑکا ڈھونڈنا ہے۔ تمہاری نظر میں کوئی ہے؟“

”میری نظر میں؟“ وہ عقبی دیوار پہ لگے آئینے کے سامنے اپنے بال سنوار رہی تھی جب نینا کے اچانک

کے مجھ سے مندر میں بیابہ تو رچا لیا لیکن بعد میں ہر گزرتا دن اس کے گلٹ کو پرہا مانا گیا۔“

”آئی کانٹ بلیواٹ، یہ اتنا بڑا ایٹو نہیں جتنا کہ پاپا نے اسے بنا ڈالا۔ کرلی شادی تو کر لی، سوواٹ، آئی کین انڈر اسٹینڈ کہ دادا، دادی خفا ہوئے ہوں گے لیکن پاپا منانے کی کوشش کرتے تو کبھی نہ کبھی دیر سویر سے وہ لوگ مان ہی جاتے، معاف کر دیتے پاپا کی غلطی۔“

”تم نہیں سمجھو گی۔ یہ آج سے تقریباً“ چوبیس سال پہلے کی بات ہے۔ تم امریکہ میں پل بڑھی ہو، نئے دور کی لڑکی ہو، اس کے باوجود اپنے پاپا کے مزاج اور ہمارے گھر کے ماحول سے اندازہ لگا سکتی ہو کہ آج سے پچیس سال پہلے یہ رواج کتنے اٹل ہوتے ہوں گے۔ تمہارے پاپا اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود بعض باتوں میں اتنے دقیقہ نوسی ہیں تو تمہارے دادا۔۔۔ جو ٹھیکل برہمن مہاراج تھے، وہ کتنے اٹل ہوں گے۔

آج نیویارک میں سالوں بسنے کے بعد بھی ہم اپنے سنہکار نہیں بھولے تو ناگ پور کے اس کونے میں اپنی چھوٹی سی دنیا بسائے تمہارے دادا، دادی کے لیے تو وہ سنہکار ہی ان کی پوری زندگی تھے۔ وہ تمہارے پاپا کی یہ غلطی معاف نہیں کر پائے اور انہیں مرتے دم تک منہ

نہ دکھانے کی قسم دے دی، تمہاری طرح ابھی اور میں بھی یہی سمجھتے تھے کہ شادی کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک دو سال تک ہم ان کی ناراضی ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن اس قسم نے ہماری ہمت توڑ دی۔ ابھی دل برداشتہ ہو کے بھارت چھوڑنے کا فیصلہ کر بیٹھا اور آج تک خود کو پردیس کاٹنے کی سزا

دے رہا ہے۔ اس کے ماما پتا اب سورگ باشی ہو چکے ہیں، وہ ابھی سے ناراض ہی یہ سنسار چھوڑ گئے، یہ غم ابھی کو چین نہیں لینے دیتا کہ وہ ان سے معافی نہیں مانگ سکا۔ اور ان سب کا کارن کہیں نہ کہیں میں ہی ہوں۔“

”اب آپ پاپا کے گلٹ کو اپنا گلٹ نہ بنائیں۔ بھگوان جانتا ہے کہ آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا اور پاپا نے بھی کسی غلط کام کے لیے دادا، دادی کو ناراض نہیں



کو الیٹھ اس میں موجود ہوں۔ باقی کی شرطیں اگر تم بتانا چاہو تو اچھا ہے کہ کتنا قد کاٹھ ہو، رنگ روپ کیسا ہو، کتنا پڑھا ہو، کیسے مزاج اور سبھاؤ کا ہو۔“  
 ”وہ۔۔۔“ پریتی کچھ بتاتے بتاتے رک گئی۔ آئینے میں تنگ کرتا عکس اب آنکھوں کی پتلیوں میں مسکرا رہا تھا۔

”اس کی مسکراہٹ بہت خوب صورت ہے۔“  
 اس نے سرگوشی کی اور اپنی ہی مدھم آواز پہ سم کے چونک گئی۔

”میرا مطلب ہے کہ اس کی مسکراہٹ بہت خوب صورت ہو۔۔۔ وہ عورت کی عزت کرنا جانتا ہو، باتیں بہت اچھی کرتا ہو۔۔۔ اور۔۔۔ اور“ وہ پلکیں بند کیے اس شبیہ کے سارے راز کھولتے کھولتے رک گئی۔

”بٹ ماما! کیا یہ ضروری ہے کہ آپ میری بتائی ہوئی پسند کے مطابق جو لڑکا ڈھونڈیں، اس میں واقعی یہ ساری باتیں موجود ہوں، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کو دھوکا ہوا سے جانے میں!“

”تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے پریتی! کہ تم اریج میرج کے حق میں نہیں ہو۔“ نینا نے قیاس ظاہر کیا جس سے پریتی نے تکیفًا بھی انکار کرنا ضروری نہ سمجھتا۔

”لیس، آف کورس، لیکن فی الحال میں کوئی لو میرج بھی پلان نہیں کر رہی۔ بلیومی، میرا دل اور دماغ دونوں اس وقت بالکل صاف ہیں۔ ان پہ کسی کا نام نہیں لکھا۔“ ایسا کہتے ہوئے اندر کہیں سے کسی نام کی بازگشت بڑے زور سے گونجی تھی۔ وہ اپنے آپ سے ڈر گئی۔

”مجھے کچھ وقت چاہیے۔“ پتہ نہیں یہ مہلت اس نے کس سے مانگی تھی اپنی ماما سے۔۔۔

خود سے۔۔۔  
 یا پھر۔۔۔ اس عکس سے۔۔۔



”میں کوئی تمہاری سکھی یا سہیلی ہوں جو میرا

پوچھے سوال پہ بری طرح چونک گئی۔ آئینے میں اسے اپنے عکس کے بجائے کوئی اور شبیہ نظر آئی تھی۔  
 ”ہاں ہے کوئی ایسا سندر سالز کا جو میری شہزادی کو پسند ہو؟“ اس نے چھیڑا۔

”پلیز ماما۔۔۔ وہ سرخ ہو گئی۔  
 ”کم آن پریتی! وی آر فرینڈز۔ شراؤ نہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو بتا دو۔“

”آپ نے خود ہی تو کہا ہے ماما! کہ ہم فرینڈز ہیں۔ پھر ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ ایسی بات ہوتی اور میں نے اب تک آپ کو نہ بتایا ہو تا۔ بلیومی میری نظر میں کوئی نہیں۔“ اس نے آئینے میں نظر آتی شبیہ سے نظریں چرائیں۔

”میرا مطلب ہے کہ اس نیت سے تو مجھے کوئی پسند نہیں ہال ویسے بہت سے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے پسند ہیں۔“

”بہت سے۔۔۔“ نینا حیران ہوئی۔

”اوہ۔۔۔ وہ یقیناً“ اچھے لڑکے ہوں گے جب ہی ان کی کوئی نہ کوئی بات تمہیں پسند ہے۔ کیا ان میں سے کوئی ہندوستانی بھی ہے؟“

”اوہ لیس ماما! دو انڈین بھی ہیں۔ ایک ریتھک روشن اور دوسرا شاہ رخ خان۔ اس کے علاوہ میرے باقی کے تین فیورٹ ہیروز ہالی وڈ کے ہیں، ان کے نام تو آپ ہرگز نہ جانتا چاہیں گی۔“ اس نے ہنسی میں بات اڑائی۔

”تم اپنے پیپا کے سامنے ریتھک کا نام ضرور لیتا، وہ برہمن ہے اور تمہارے پیپا کا بھی فیورٹ ہے۔ ابھے کا کچھ بھروسہ نہیں اپنی لاڈلی کے لیے وہ شاید ریتھک روشن کو بھی گھر جمانی بننے پہ رضامند کر لے۔“ نینا بھی ہنس پڑی۔

”اوکے، ٹاؤبی سیریس، اگر تم واقعی کسی کو پسند نہیں کرتیں تو اس کا مطلب ہے ہمیں ہی کوشش کرنا ہوگی لیکن تم اپنی پسند تو ہمیں بتا سکتی ہو۔ ابھے کی تو بس دو ہی شرطیں ہیں، ایک یہ کہ لڑکا ہندوستانی اور برہمن ہندو ہو اور دوسری شرط یہ کہ تمہیں خوش رکھنے کی ساری



جو اس ساری گفتگو کے دوران لیپ ٹاپ پہ نبھانے کس مصوفیت میں مگن تھیں۔  
 ”اگر تم دونوں میں سے کافی لینے کون جائے گا؟“  
 ”تم خود کیوں نہیں جانتے؟“ سارہ نے تشریح کے کہا۔

”میں تم دونوں کو اس دوران جگہ پہ اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا۔“ وہ مزے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔  
 وہ سب آج پلنگ منانے ساحل پہ آئے تھے اور یہ جگہ بھیڑ اور شور شرابے سے خاصی دور تھی۔

”اور ہم میں سے ایک کو اکیلا ضرور بھیج سکتے ہو؟“  
 ”اس لیے کہ دوران جگہ صرف یہ ہے، جہاں فوڈ اسٹالز اور کافی شاپس ہیں، وہاں خاصا رش اور گنماگھی ہے۔ تم مجھے دور تک جاتی نظر آؤ گی، میں یہاں سے تمہیں واپس کروں گا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔  
 ”تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہارے کہنے پہ کافی لینے چلی جاؤں گی؟“

”ریلیکس سارہ! میں چلی جاتی ہوں۔“ اور پھر وہ منصف کے کہنے پہ بھی نہ رکی جو بے چارہ دور تک آوازیں دیتا رہ گیا کہ وہ محض مذاق کر رہا تھا۔ دراصل وہ خود بھی سارہ کے جانے کے بعد منصف کے ساتھ اکیلے نہ بیٹھنا چاہتی تھی۔ ڈر تھا کہ وہ ادھر اور اس عکس پوری طرح واضح ہو کے کبھی نہ مٹنے کے لیے دل و دماغ پہ پوری طرح نقش نہ ہو جائے۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کے اٹھ جانے پہ منصف کے چہرے کی رنگت پھکی پڑ گئی تھی۔

”تو تم یہ چاہتے تھے کہ میں یہاں تمہیں اور پریتی کو اکیلا چھوڑ دوں؟“ سارہ نے پچھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”تم ہم دونوں کو غلط سمجھ رہی ہو۔“ منصف اس کے اعتراض کو خاطر میں نہ لایا۔

”آں ہاں، دونوں کو نہیں۔۔۔ صرف تمہیں۔“ سارہ نے تصحیح کی۔

”پریتی کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ اور شاید تمہیں بھی۔ پیچھے ہٹ جاؤ منصف، پریتی کے دل میں

تمہاری متنی کی تقریب میں شریک ہونا اشد ضروری ہے۔“ ارباز الیاسی نے نیلم سرور کے مسلسل اصرار پہ رنج ہو کے کہا۔ کل ہی اسے اطلاع ملی تھی کہ کلکتہ سے اس کے چچا مختار الیاسی عین نیلم کی متنی والے روز نیویارک پہنچ رہے تھے۔ نیو جرسی میں ان کی بیٹی بیابہ گئی تھی، اسی سے ملنے کی غرض سے آ رہے تھے اور اسی وجہ سے ارباز اس سے تقریب میں شرکت نہ کرنے پہ پیشگی معذرت کر رہا تھا لیکن وہ کوئی عذر ماننے پہ تیار نہ تھی۔

”جب سارا گروپ آ رہا ہے تو تمہاری غیر موجودگی زیادہ محسوس ہو گی اور یہ تمہارے انکل اپنی بیٹی سے ملنے آ رہے ہیں تو سیدھا ان کی طرف کیوں نہیں جاتے؟“ وہ تنک کر بولی۔

”ریڈیشنز (روایات) مالی ڈیفرنڈ! وہی برائے رسم و رواج۔۔۔ انکل، سعیدیہ سے ملنے جائیں گے مگر وہاں رہیں گے نہیں۔ آفٹر آل وہ ان کی بیٹی کا سرال ہے۔ شکر ہے کہ اب بیٹی کے سرال سے کم از کم پانی نہ پینے والی قسم تو ٹوٹ ہی چکی ہے لیکن وہاں رہنے پہ وہ ہرگز تیار نہ ہوں گے۔ میں انہیں ایرپورٹ سے لے کے سیدھا اپنے فلیٹ پہ جاؤں گا۔ دن بھر وہاں آرام کریں گے، ظاہر ہے اتنا لمبا سفر ہے اور کل ہم نیو جرسی کے لیے نکلیں گے۔“

”آرام تو وہ دن بھر کریں گے، شام کو تو تم آ سکتے ہو۔“ یہ منصف تھا۔

”مگر کیسے یار؟ ان کو آئے چو میں گھنٹے بھی نہ ہوئے ہوں گے اور میں انہیں فلیٹ پہ اکیلا چھوڑ کے فنکشن اینڈ کرتا پھروں۔“

”تم انہیں ساتھ لے کے تو فنکشن اینڈ کر سکتے ہو نا۔“ نیلم نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ ”آفٹر آل میرے سب فرینڈز وہ فیملی انوائیٹڈ ہیں۔ میں خود تمہارے انکل کو فون کر کے باقاعدہ انوائٹیشن دے دوں گی۔ اب مزید کوئی بحث نہیں، چلو بچ کا کچھ بندوبست کریں۔“ وہ رنچا اور ارباز بچ لانے کے لیے چلے گئے، پیچھے منصف، سارہ اور پریتی کے ساتھ رہ گیا



تمہارے لیے کچھ نہیں۔“  
 ”اور اگر یہی مشورہ میں تمہیں دوں تو؟“  
 ”کیا مطلب؟“

”بچے ہٹ جاؤ سارہ واؤد اطر ابلی۔ منصف علی  
 تارڑ کے دل میں تمہارے لیے کچھ نہیں۔“ اس نے  
 سارہ کے کچھ کہنے سے قبل ہی صاف جواب دے دیا  
 لیکن وہ قطعی مایوس نہ ہوئی۔

”لیکن سارہ ڈیوڈ کے دل میں تو تمہارے لیے بہت  
 کچھ ہے اور صرف دل ہی میں نہیں، میرے پاس اور  
 بھی بہت کچھ ہے منصف!“ وہ عجیب طرح سے  
 مسکرائی۔

”مثلاً؟“ وہ اس کی پراسرار مسکراہٹ سے کچھ  
 الجھا۔

”پریتی نہ تو اتنی حسین ہے اور نہ ہی اتنی لکی۔  
 جتنی کہ میں۔“

”تمہارے حسین ہونے یا نہ ہونے یہ تو بعد میں  
 بحث کریں گے کہ یہ ایک الگ معاملہ ہے لیکن پہلے تم  
 اپنے لکی ہونے کی وضاحت کرو۔“

”یو نو منصف، لاسٹ ایئر جب میں تیونس گئی تو  
 میرے پیانے کیا کہا۔۔۔ وہ اس سال لیگلی اپنی پر اپنی

کامکسٹی پرمینٹ میرے نام کرنے والے ہیں۔ ان  
 کی اپنی دوسری وائف سے بھی ڈائی ورس ہو گئی ہے

ان سے ان کی اولاد بھی کوئی نہیں۔ میں نے ماما کو ابھی  
 تک یہ بات نہیں بتائی۔ یو ڈونٹ نو کہ وہ کتنی خود غرض

ہیں۔ میرے نام پر اپنی ہونے کا سنتے ہی ان کی وہ ساری  
 متاجاگ جائے گی جو پچھلے کئی سالوں سے گہری نیند

میں ہے۔ انہوں نے مجھے ایک ٹوٹی ہوئی فیملی، ادھوری  
 پہچان اور نامکمل زندگی کے علاوہ دیا ہی کیا ہے۔ ساری

عمر میں نے محرومیوں میں گزار دی، باقی کی عمر اپنی مرضی  
 سے گزارنا چاہتی ہوں۔ پیانے ڈائی ورس کے بعد ماما کو

کم دولت نہیں دی تھی۔ جو سب انہوں نے شراب  
 نوشی اور اپنے کم عمر بوائے فرینڈز پر اڑادی حالانکہ اس

کو میرا حق تھا۔ پیانے انہیں فرانس میں جو مکان خرید  
 کے دیا تھا وہ بھی بیچ کے ان ہی عیاشیوں میں اڑادیا۔ وہ

اس پر اپنی کو بھی مہینوں میں چٹ کر جائیں گی۔ اس  
 لیے اس بات کی میں نے انہیں ہوا تک نہ لگنے دی۔“  
 ”مجھے تمہارے حالات سے ہمدردی ہے لیکن میں  
 اور کیا کر سکتا ہوں ماما۔“ وہ سب سمجھتے ہوئے بھی

انجان بن رہا تھا۔  
 ”تم وہ پہلے شخص ہو جسے میں یہ راز بتا رہی ہوں۔“  
 ”اس ذرہ نوازی کی وجہ؟“

”کیونکہ تم وہ پہلے شخص ہو جس سے میں نے سچا  
 پیار کیا ہے۔“

”اور جھوٹے پیار کس کس سے کر چکی ہو؟“ وہ  
 ہنس پڑا۔

”ٹی سیولس منصف۔ میں نے تمہارے علاوہ کسی  
 اور سے محبت نہیں کی۔“

”ویری سیڈ“ اس کا مطلب ہے جان رکی اور بھائیہ  
 سے بغیر محبت کے ہی تم نے اتنے گہرے تعلقات قائم

کر لیے۔“ اس نے لفظ ”گہرے“ پہ زور دیتے ہوئے  
 کہا۔

”وہ میری حماقت تھی۔“ وہ شرمندہ ہوئے بغیر  
 بولی۔

”حماقت نہیں سارہ! حماقتیں۔“  
 ”what ever (جو بھی ہے) اس نے سر جھٹکا۔

”آپ تو میں کہہ رہی ہوں ناں کہ میں تم سے محبت  
 کرتی ہوں۔“

پریتی کے کان میں سارہ کے یہ اونچی آواز میں کہے  
 الفاظ پہنچے تو اس کے قدم پکاپک رک گئے۔ ان دونوں

کی پشت اس جانب تھی اس لیے وہ اس کا آنا  
 محسوس نہ کر سکے۔

”اور میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ میں تم سے محبت تو  
 کیا دوستی تک قائم رکھنے کا روادار نہیں۔“

”اوہ، تو پریتی کا جادو سر چڑھ کے بول رہا ہے۔“ وہ  
 سلگ گئی۔ پریتی کا دل اپنے نام پہ سمٹ سا گیا۔

”شٹ آپ سارہ! جبار جواب تم نے پریتی کا نام  
 بھی لیا تو۔۔۔“

”کیوں دل کا چور پکڑا گیا ہے اس لیے۔“



”دل میں چور نہیں ہوتا سارہ! صرف۔۔۔ اپنی  
وے۔۔۔“ اس نے کچھ کتے کتے لب بھینچ کر خود کو روک  
لیا۔

”پریتی ایک اچھی اور معزز لڑکی ہے۔ میں دل سے  
اس کی عزت کرتا ہوں، نہ صرف اس کی بلکہ اس جیسی  
سب لڑکیوں کی جو زمانے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے  
جدید تقاضوں کے مطابق خود کو ہم آہنگ رکھتے ہوئے  
بھی اپنی روایات سے ناتا نہیں توڑتیں۔ میں ہرگز  
نہیں چاہوں گا کہ تم اپنی گندی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے  
ہوئے اس کا نام یوں اچھا لو۔ تمہیں اپنے ارادوں میں  
ناکامی کا جو بھی غصہ ہے وہ مجھ پہ نکال سکتی ہو، اس کے  
لیے کسی شریف لڑکی کو بیچ میں لانے کی ضرورت  
نہیں۔“

”اونہ، شریف لڑکی، مائی فٹ۔۔۔ میں تو بھول ہی  
گئی تھی کہ تم پاکستانی مرد اور ہر جتنا مرضی منہ مار لو  
آخر کار شریف لڑکیوں پہ ہی دل ہارتے ہو۔ اوکے، میں  
نے کون سا تمہیں عمر بھر باندھے رکھنے کی بات کی  
ہے۔ مانا، میں نہیں ہوں بقول تمہارے شریف لڑکی،  
معزز لڑکی، سوواٹ؟ مت کرنا تم مجھ سے شادی۔ کم  
آن یار، دوستی کرنے میں کیا حرج ہے۔ شادی جیسی چیز  
کو میں بھی نہیں مانتی۔ مجھے تم اچھے لگتے ہو، میرا دل  
چاہتا ہے کہ تم بھی میرے جذموں کی ویسی ہی پذیرائی  
کرو۔ تمہارا کیا جاتا ہے، بلکہ الٹا ملے گا۔ کچھ دنوں کی  
بات ہے، میرے پاس اتنا پیسہ ہو گا کہ تمہیں عیش  
کرا دوں گی۔ سال دو سال بعد میں خود تنگ آ کے تم  
سے پیچھا چھڑانا چاہوں گی تو تم نہ مانو گے۔“ وہ ہنسی اور  
اس وقت پریتی کو اس کی وہ ہنسی اتنی مکروہ لگی۔ جسے وہ  
نت نئی تشبیہات کے ساتھ سراہا کرتی تھی۔

”تمہیں مجھ سے نہ تو محبت ہے سارہ! نہ ہی تمہیں  
میری کشش دوستی پہ اکسا رہی ہے، تمہیں مجھ سے  
صرف ضد ہے۔ میں کسی قسم کی پارسائی کا دعوا نہیں  
کروں گا لیکن یہ بات حلفیہ کہہ رہا ہوں کہ میں نہ تو  
ظاہری کشش کی وجہ سے۔۔۔ نہ کسی لالچ میں۔۔۔ حتیٰ کہ  
محبت تک کے نام پہ بھی کبھی کسی لڑکی کو استعمال نہیں

کر سکتا۔ تو خود کو تمہارے ناپاک ارادوں میں استعمال  
ہونے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں۔ میں شو پیپر  
نہیں ہوں سارہ داؤد۔ ہاں تمہیں اپنی خواہشات کی  
نجاست صاف کرنے کے لیے ایسے شو پیپر جا بجا پڑے  
نظر آئیں گے، جاؤ انہیں استعمال کرو۔“

”یوں آف۔۔۔ سارہ بلبلاتا ہے۔“  
”تم میرے جیسی لڑکی ڈیزرو ہی نہیں کرتے۔  
تمہارے لیے تو یہ پریتی جیسی۔۔۔“

”بلکو اس بند کرو۔“ منصف دھاڑا۔ ”میں نے  
تمہیں وارننگ دی تھی کہ اپنی زبان سے دوبارہ اس کا  
نام مت لینا۔ تمہیں مجھ سے کوئی لینا دینا نہیں، پھر  
بلاوجہ ایک معصوم لڑکی کو کیوں بدنام کر رہی ہو۔“  
”اؤہ۔۔۔ معصوم، جانتے ہو وہ معصوم اور شریف  
لڑکی تمہارے بارے میں کیا فیلنگز رکھتی ہے؟“

اس کی بات پہ ڈھائی فٹ کے فاصلے پہ کھڑی پریتی  
دونوں نے بے ساختہ اپنا دل تھام لیا، اس کی رنگت زرد  
پڑ گئی تھی۔

”وہ تم سے اور تمہارے جیسے سب مسلمانوں سے  
نفرت کرتی ہے۔“ سارہ نے پریتی کے بارے میں من  
گھڑت قیاس آرائی کر کے اسے بھڑکانا چاہا۔

”میں نہیں مانتا کہ اس کے ذہن میں موجود شکوک  
و شبہات کو نفرت کا نام دیا جاسکتا ہے اور اگر ہے بھی تو  
وہ اپنے خیالات کے بارے میں آزاد ہے۔ میں بہر حال  
کسی بھی مذہب کے انسان سے صرف اس لیے نفرت  
نہیں کر سکتا کہ وہ میرا مذہب نہیں۔“

اب پریتی کے لیے یہ ڈھائی فٹ کا فاصلہ طے کرنا  
اتنا دشوار نہ رہا تھا۔ وہ اعتماد سے قدم اٹھاتے ہوئے  
آگے بڑھی۔

”کافی۔“ اس نے فلاسک نیچے رکھتے ہوئے نارمل  
انداز میں کہا۔ اس کے چہرے سے بالکل ظاہر نہ ہو رہا  
تھا کہ وہ ان کی گفتگو سن چکی ہے البتہ اس نے دوزیدہ  
نظروں سے ان دونوں کے چہروں کا جائزہ ضرور لیا۔  
منصف کے چہرے پہ وہی ازلی سکون تھا جو ہمیشہ سے  
اس کی خاصیت رہا تھا جبکہ سارہ کا چہرہ تنک اور طیش



یہ کشن درست کر کے نیم دراز ہوتے ہوئے نکھل سے سوال کیا۔ آج اس کا فری ڈے تھا اور وہ کل نیلم کی منگنی کے فنکشن کی تیاری کے سلسلے میں چرے پہ ڈمارک لگائے بیٹھی تھی۔

”بویے، ابھی ابھی اٹل لایا ہے۔“ پوری فیملی کو انڈین موویز کا کریر تھا۔ شاید وطن سے دور وطن سے وابستہ ہر چیز کا شوق یونہی جنون بن جایا کرتا ہے۔ یا پھر شاید۔۔۔ وہ اسی طرح اپنے اندر کی تسکین کیا کرتے تھے۔۔۔ اس تہذیب کو دیکھ کے اور محسوس کر کے۔۔۔ جو اس پردیس میں ان کے لیے نامانوس اور اجنبی تھی، مگر جو ان کی اپنی تھی اور جسے وہ چاہ کے بھی خود سے الگ نہیں کر پاتے تھے۔

”یہ وہی مووی ہے ناں جس میں ایک ہندو لڑکا، ایک مسلمان لڑکی کو گھر سے بھاگ کر شادی کر لیتا ہے؟“ ”یہ تم لوگ کیا بے کار کی فلمیں دیکھتے رہتے ہو۔“ نینانے اعتراض کیا۔ ”دیکھنی ہی ہیں تو پرانی فلمیں لایا کرو۔ اولڈ از گولڈ مانی سن! وہ دیپ اور مدھوبالا کی نینسی لواسٹوریز۔۔۔ وہ راج کپور اور نرگس کے مدھر گیتوں والی فلمیں۔۔۔ آج کل تو ہر فلم میں یہی ایک موضوع باقی رہ گیا ہے، دودھرم کے لوگ۔۔۔ یا پھر دو مختلف دیشوں کے پریمی۔۔۔“ ”لیکن ماما! اس کا میوزک زبردست ہے۔“ اٹل نے ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”اللہ اکبر۔“

منیشا کو زالہ، جس نے اس فلم میں ایک مسلمان لڑکی کا رول ادا کیا تھا۔ برقعہ میں ملبوس، صبح کی اولین ساعتوں میں کشتی میں سوار جا رہی تھی اور فضا اذان کی آواز سے گونج رہی تھی۔ چرے پہ ماسک لگائے، آنکھوں پہ کھیرے کے قتلے رکھے لیٹی ہوئی پریتی ذرا بے چین سی ہوئی۔ ”اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔“

”ماما۔۔۔“ اس نے وہیں سے آواز دی۔ ”یہ آواز کہاں سے آرہی ہے ماما؟“

”اسی فلم سے۔“ نینانے بھی ہاتھ سے پین رکھ

کے ملے جلے جذبات کے زیر اثر مسخ ہو رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہ رک سکی اور تنہا تے ہوئے اٹھ کے چل دی۔

”یہ سارہ کہاں غائب ہو گئی؟“ رہ جانے آتے ہی سوال کیا۔

”ہمیں ان دونوں کو اکیلا چھوڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ ارباز نے منصف کی جانب اشارہ کیا جس کے ہونٹوں پہ دہلی دہلی مسکراہٹ سے اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ضرور ان دونوں کے درمیان پھر سے گرما گرمی ہوتی ہوگی۔

”اوہ۔۔۔ ناٹ اگین۔۔۔“ نیلم دھب سے بیٹھ گئی۔ ”پار! کم از کم میری ایک بھینٹ سے پہلے کوئی بد مزگی نہیں ہونی چاہیے تھی۔“

”تمہاری تو ہر ناں منگنی پہ ٹوٹتی ہے، فکر مت کرو ایسی کوئی قتل و غارت والی بات نہیں ہے، تم تو جانتی ہو، کئی موضوعات پہ ہماری بحث ذرا زیادہ سی تلخی اختیار کر لیتی ہے، اسے سیرپسلی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ پریتی نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ اسے حیرت اس بات پہ تھی کہ سارہ سے ناخوشگوار تعلقات ہونے کے باوجود وہ اس کا بھرم رکھ رہا تھا۔ کیا عجب تھا کہ اس سے پہلے بھی وہ ایسا کرتا آیا ہو اور دونوں کے مابین کھچاؤ اسی وجہ سے ہو، جسے آج سے پہلے وہ بھی دوسروں کی طرح لبرل ازم اور قدامت پرستی کی روایتی بحث کا نتیجہ سمجھتی رہی تھی۔

”اور کوئی ہوتا تو سارہ ڈیوڈ جیسی پرکشش لڑکی کی اس پرکشش آفر کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا اور دوستوں میں بیٹھ کے فخر سے دہراتا۔ اور کوئی ہوتا تو اپنے انکار اور سارہ کی توہین کے قصے مزے لے لے کے سناتے ہوئے اپنی مردانہ انا کو بلند کرتا۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ اور کوئی ہوتا تو ایسا کرتا ہی کیوں؟ سارہ جیسی لڑکی کو نظر انداز کرنا، کسی اور کے بس کی بات بھی تو نہیں۔“ وہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔



”کون سی مووی ہے؟“ پریتی نے لاؤنج کے صوفے



کے اسکرین کی جانب توجہ کی۔  
 ”آہ! آجیوم بند کرو“ ابھے نے سن لیا تو طوفان لے  
 آئے گا گھر میں۔“

ایک منٹ.... رہنے دو۔“ وہ بے چینی سے اٹھ  
 بیٹھی، آنکھوں سے کھیرے کے قتلے ہٹا کے اس نے  
 اسکرین کی جانب دیکھا، سین بدل چکا تھا اور پس منظر  
 سے گو بجتی اذان کی آواز بھی۔  
 ”نہ کیا تھا ماما؟“

”تمہیں اتنا بھی نہیں پتا.... مسلمانوں کے کوئی  
 دھارمک اشلوک تھے، اسی لیے تو میں ڈر رہی تھی کہ  
 ابھے نہ سن لے۔ برہمن کے گھر میں اذان۔“

”یہ تو میں جانتی ہوں کہ یہ مسلمانوں کے خاص لفظ  
 ہیں لیکن اس کا مطلب کیا ہے اور یہ.... یہ کس لیے  
 اور کیوں کہے جاتے ہیں۔“ اس کے چہرے سے ابھرن  
 اور اضطراب ہویدا تھا جسے ڈاکٹر نینا نے خاصے اچھے  
 سے نوٹ کیا۔

”مجھے کیا پتا.... اور تم اتنا انٹرسٹ کیوں لے رہی ہو؟  
 لیکن وہ نینا کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے نکسل  
 کے ہاتھ سے ریموٹ لے کے وہی سین ریو اسنڈ کر  
 چکی تھی۔

”اللہ اکبر۔“

”بالکل وہی.... بالکل وہی شبدھ۔“ وہ بڑبڑاتی تو نینا  
 کو اپنا سوال دہرائی۔

”اما! آپ جانتی ہیں کہ اکثر مجھے ایک سپنا پریشان  
 کرتا ہے۔“

”وہی سپنا، جس میں ایک عجیب سا منتر تمہیں بار  
 بار سنائی دیتا ہے، کسی دوسری بھاشا کے شبدھ تمہیں  
 کھینچتے ہیں؟ کیا اب بھی وہ سپنا تمہیں آتا ہے؟ پہلے  
 تو تم بہت ڈرا کرتی تھیں۔“

”ہاں بچپن میں واقعی اس سننے کو دیکھنے کے بعد میں  
 ڈر جایا کرتی تھی، لیکن ماما! وہ سپنا اب بھی اکثر مجھے تنگ  
 کرتا ہے۔ میں اب ڈرتی نہیں لیکن پریشان ضرور ہو  
 جاتی ہوں کہ کیوں؟ کس لیے.... یہ سپنا اتنے سالوں  
 سے بار بار مجھے دکھائی دے رہا ہے، اس کا کارن کیا ہے؟

اور سب سے بڑی الجھن یہ کہ میں اس سننے کو سمجھ  
 نہیں پاتی ہوں۔ وہ بالکل کوئی دوسری بھاشا ہے، جس  
 کے اجنبی شبدھ.... کسی منتر کی طرح میرے کان میں  
 پھونکے جاتے تھے اور میں جیسے کسی جادو کے اثر میں  
 آجاتی تھی.... وہ شبدھ کیا تھے، وہ بھاشا کون سی ہے اور  
 وہ منتر کیا ہے.... میں نے آج جانا ہے.... لیکن اسے  
 جاننے کے بعد بھی میری الجھن کم نہیں ہوئی بلکہ اور  
 زیادہ ہو گئی ہے۔“ اس نے سر کوٹھنی سی کی۔

”کیا مطلب؟“ نینا خوفزدہ ہو گئی۔ کسی خوف کے  
 زیر اثر اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسکرین کی  
 جانب دیکھا اور پھر پرتی کے پریشان چہرے کی جانب۔  
 ”کیا سمجھا ہے تم نے؟“

”سہی کہ وہ شبدھ عربی بھاشا کے تھے اور وہ آواز  
 اذان کی تھی۔“ اس انکشاف پہ نینا گرنے کے سے  
 انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی سہمی ہوئی نظریں  
 پرتی کے چہرے پہ جمی تھیں۔

”لیکن ماما! مجھے کیوں! مجھے یہ آواز کیوں سنائی دیتی  
 ہے! میرا اذان کی آواز سے کیا تعلق۔“  
 ”یہ.... یہ کچھ نہیں پرتی! یہ محض اتفاق ہو گا۔“  
 نینا نے اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے ہوئے ٹالا۔  
 ”اتفاق ایک بار ہوتا ہے ماما! بار بار نہیں۔“

”میں نے کہا ناں پرتی! یہ صرف اتفاق ہے.... یا پھر  
 تمہاری غلط فہمی۔“ نینا نے سخت لہجے میں اسے ڈانٹا۔  
 ”ایک بات کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔ وہ صرف  
 سپنا ہی تو ہے۔ سننے میں انسان بہت کچھ ایسا دیکھتا ہے  
 جس کا کوئی مطلب نہیں ہوتا اور ضروری تو نہیں یہ  
 واقعی وہی آواز ہو۔ سننے کی باتیں اتنی اچھی طرح کب  
 یاد رہاتی ہیں۔“

”لیکن جو سپنا بچپن سے آپ کے ساتھ ہو، اسے  
 یاد رکھنا....“ نینا نے اس کی بات فوراً کاٹ دی۔

”بس کرو پرتی! تم جانتی ہو کہ مجھے بے کار کی بحث  
 پسند نہیں، اور اگر ابھے کے کان میں بھنک پڑ گئی تو وہ  
 سارا الزام پھر سے تمہاری مسلم فرینڈز کو دے گا کہ ان  
 کے ساتھ رہ رہ کے اب تمہیں سپنوں میں بھی اذان



سنائی دیتی ہے۔ پھر جاتی رہتا نیلم کے گھر فلکشن میں۔“  
 نہینا نے ڈرا دیا اور وہ واقعی خاموش ہو گئی۔ مگر اس کی الجھن جوں کی توں تھی۔



لائٹ بیچ کلر کی بنار سی ساڑھی میں ملبوس کندن کا بنگالی سیٹ پہنے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس بات کا احساس اسے سب کے رہنما کس اور منصف کی نظروں نے دلایا۔ وہ بھی آج ملتان پر طرز کے مخصوص شلوار ٹیص میں ملبوس بہت اچھا لگ رہا تھا۔  
 ”بہت سی آئینہ کی نظریں تم پہ ہیں منصف!“  
 نہینا نے اسے خطرے کا احساس دلایا۔

”اور میری؟“ وہ دیکھ اسے رہا تھا اور سوال نہینا سے کر رہا تھا۔ گھبراہٹ میں پریتی ہاتھ میں پکڑا موٹی کی کلیوں کا ہار مسل کے رہ گئی جو لڑکے والوں کے سواکت کے لیے تھام رکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ نہینا اس کے سوال کا مفہوم بھانتی پا اس کی بولتی نگاہوں کے تعاقب میں پریتی تک پہنچی ”رباز وہاں چلا آیا۔“  
 ”میٹ مالی انکل مختار الیاسی۔“

اس کے ہمراہ ایک خوش پوش اور خوش مزاج سے انکل تھے جو رباباز سے خاصی مشابہت لیے ہوئے تھے۔ صرف داڑھی کا فرق تھا۔ رباباز کلین شیو تھا جبکہ مختار الیاسی کے باوقار چہرے پہ گھنی داڑھی بھلی محسوس ہو رہی تھی، ماتھے پہ محراب کا نشان۔ ہونٹوں پہ مہربان مسکراہٹ۔ بے حد شفقت اور خوش دلی سے رباباز کے دوستوں سے ملے۔

”میں بریلی سے ضرور آئی ہوں انکل! لیکن وہاں کے بازار میں کچھ گرا کے نہیں آئی۔“ نہینا نے کھلکھلا کے کہا تھا۔

”پریتی دیون۔۔۔“ پریتی نے احترا ”ہاتھ جوڑ کے کہا۔ وہ اس کے چہرے پہ نظر ڈالتے ہی باقاعدہ چونک سے گئے، مسکراتے لب یکایک سٹ گئے۔

”دیون۔۔۔ پریتی دیون۔۔۔“ وہ زیر لب دہرانے لگے۔

”اگر تم مائزنہ کرو بیٹا! تو کیا میں تمہاری مدد کا نام جان سکتا ہوں؟“ اس سوال پہ پریتی قدرے حیران ہوئی عموماً ”مکمل تعارف حاصل کرنے کے لیے باپ کا نام دریافت کیا جاتا ہے لیکن یہ تو۔۔۔“

”نہینا۔۔۔“ کچھ توقف کے بعد اس نے بتایا تو انکل مختار کے پر اشتیاق چہرے پہ مایوسی پھیل گئی۔

”نہینا؟“ اوہ سوری مجھے لگا جیسے میں تمہاری مدد کو جانتا ہوں، دراصل تمہاری صورت بہت جانی پہچانی سی لگی۔ عام طور پر بچیاں اپنی ماؤں کا پرتو ہوتی ہیں اس لیے مجھے لگا شاید تم۔“

”سب یہی کہتے ہیں کہ میں بھی بالکل اپنی ماما جیسی ہی ہوں، ڈاکٹر نہینا بھنے دیون جیسی۔“

”ڈاکٹر!“ وہ پھر سے چونکے ”وہ ڈاکٹر ہیں؟۔۔۔ اور ایسے دیون۔۔۔ کیا وہ بھی؟“ وہ بے تابی سے پوچھ رہے تھے۔

”جی، میرے ماما پتا دونوں ڈاکٹر ہیں۔ کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟“

”جن کو میں جانتا ہوں اگر یہ واقعی وہ ہیں تو میں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ عجیب پر اسرار انداز میں مسکرائے۔

”کیا تمہارے پیرش۔۔۔ بلکہ تمہارے پیپا۔۔۔ ان کا تعلق ناگ پور سے ہے؟“

”آئی ڈونٹ نو سر، وہ بھارت سے ہیں، اتنا تو پتا ہے لیکن۔۔۔“ بتاتے بتاتے وہ رک سی گئی۔ ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تھا۔ کچھ روز پہلے کے ڈاکٹر نہینا کے الفاظ اسے یاد آئے تھے۔

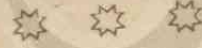
”وہ ناگ پور میں رہا کرتے تھے، لیکن تھے بچے مہاراشٹرین۔“ اگر ایک ہفتہ پہلے مختار الیاسی نے اس سے یہ سوال کیا ہو تا تو وہ بلا توقف لاعلمی کا اظہار کر دیتی لیکن اب ایسا نہ تھا۔

”ہاں، میرا خیال ہے۔۔۔ وہ ناگ پور سے ہی تھے۔ کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟“ اس نے ایک بار پھر پوچھا۔ وہ پہلے محض تھے جو بھارت سے آئے تھے اور اس کے ماما پیپا سے شناسائی کا دعوا کر رہے تھے۔



”بہت اچھی طرح تمہارے پیادے اکثر ابھیجیت مہادیون، میرے بہت اچھے دوست رہ چکے ہیں۔“  
 ”واٹ دوست؟“ وہ جی بھر کے حیران ہوئی۔ ڈاکٹر ابھے کسی مسلمان سے دوستی کیسے کر سکتا تھا۔ اسے لگا جیسے اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس نے ذہن میں مختار الیاسی کے الفاظ دہرائے اور جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ گئی۔

”اوہ آئی سی“ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میرے پیادے کا نام ابھیجیت مہادیون نہیں، ابھے دیون ہے۔ شاید نام کی معمولی سی مشابہت سے آپ کو لگا ہو گا۔“  
 ”نہیں“ مجھے یقین ہے یہ ابھے دیون، وہی ابھیجیت مہادیون ہے، اگر واقعی اس کا تعلق ناگ پور سے ہے اور وہ ایک برہمن تھا، اوم شیو مہادیون کا بیٹا ہے اور مہاراشٹرین ہے۔“



”نیلیم سچ سچ بہت پیاری لگ رہی تھی ماما! لیکن اس کا دولہا۔۔۔ خیر اس کی دیدی مریم کے ہسپتال کے مقابلے میں تو بہتر ہی تھا۔ وہ بے چاری تو اتنی سندر ہونے کے باوجود نجانے کیسے اس بچے کو سال کے موٹے اور گنجنے کے چکر میں آ گئیں۔ نیلیم کے لیے دولہا ڈھونڈتے ہوئے بھی بس دھن ہی دیکھا، ذرا نہ بچ رہا تھا وہ نیلیم کے ساتھ۔“

”یہ سب ایشور کا لکھا ہے پریتی! یہ سنجوگ اسی نے بنائے ہوئے ہیں۔ بس پرار تھنا کرو کہ وہ خوش رہے، سدا سہاگن رہے۔“

”اور پتا ہے ماما! ارباز کے ایک انکل بھی انڈیا سے آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ اگر تو تمہاری شکل تمہاری ماں سے ملتی ہے تو یقیناً میں انہیں جانتا ہوں“ میں تو بہت ایکساٹینڈ ہوئی کہ واپس آ کے آپ کو اور پیادے کو آپ کے انڈیا سے آئے ایک پرانے دوست کے بارے میں نیوز دیں گی۔ لیکن۔۔۔ وہ بتاتے بتاتے رک کے توس پہ مار ملیٹ لگانے لگی اور ڈاکٹر نیما جو ناشتے سے فارغ ہو کے اب اپنا اور آل اٹھاتے ہوئے

نکلنے کی تیاری میں تھی، ٹھٹھک کے رک گئی۔  
 ”لیکن کیا؟“

”لیکن انہیں شاید کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی تھی۔ اگر وہ کہتے کہ وہ آپ کے دوست رہ چکے ہیں تو شاید میں مان لیتی، ہو سکتا ہے شادی سے پہلے آپ دوستی کرنے کے معاملے میں اپنی سخت نہ ہونے جتنی اب پیادے کی وجہ سے ہیں لیکن ان کا دعوا تھا کہ وہ پیادے بہت گہرے دوست رہ چکے ہیں۔۔۔ ہاؤ انس پوسٹیل ماما۔۔۔؟ بھلا پیادے کسی مسلم سے اتنے اچھے تعلقات کیسے رکھ سکتے ہیں، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟“ اس نے کافی کا مگ لبوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ فیمنانے کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلادیا۔

”اور ویسے بھی وہ نام کے معاملے میں بھی کچھ کنفیوژن کا شکار تھے، ان ٹیکٹ انہوں نے مجھے بھی کنفیوز کر دیا۔ ان کی بعض باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں۔“

”مثلاً کیا باتیں۔۔۔ کیا بتایا اس نے تمہیں؟“ فیمنانے اٹکتے ہوئے بولی۔ اسے دیر ہو رہی تھی، یہ بات وہ بتا چکی تھی لیکن اب وہ ہسپتال کے لیے نکلنا بھول کے اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”یہی کہ وہ ڈاکٹر ہیں، یعنی دونوں ہی پتی اور یہ کہ وہ ناگ پور کے رہنے والے تھے، مہاراشٹرین تھے، برہمن تھے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کی باتوں پہ میرا من راضی نہیں ہوا ایک تو یہ کہ وہ پیادے دوست کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے تھے نہ صرف وہ مسلم تھے بلکہ ٹھیکل مسلم۔۔۔ واڑھی والے، نماز پڑھنے والے۔۔۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ پیادے کا نام بھی غلط بتا رہے تھے۔ آل۔۔۔ کیا کہہ رہے تھے۔“ وہ ذہن پہ زور ڈالنے لگی ”اوہ ایس۔۔۔ ابھیجیت مہادیون۔“

”ابھیجیت مہادیون! فیمنانے ہر اسال چہرے پہ یہ نام دہشت بن کے پھیل گیا۔

”اس آدمی کا نام کیا تھا؟“ فیمنانے بے تابی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پریتی نے ابھی ہوئی نظروں سے اپنے ہاتھوں پہ فیمنانے کے سر اور مرعش ہاتھوں کی مضبوط

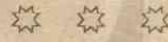


گرفت کو دیکھا۔

”مختار الیاسی۔“

”مخ۔۔۔ تار۔۔۔ مختار الیاسی؟“ نینا کے ہاتھ ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ ہاسپٹل جانے کے لیے بالکل تیار تھی لیکن اب باہر جانے کے بجائے اس کا رخ اپنے کمرے کی جانب تھا۔

”ماما۔ کیا بات ہے؟۔۔۔ کون ہے یہ شخص؟۔۔۔ کیا آپ مختار انگل کو جانتی ہیں۔۔۔؟“ بریتی بے شمار سوالوں کے ساتھ اس کے پیچھے تک گئی لیکن نینا کے کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اس نے بریتی کے کئی بار پکارنے پر بھی جواب نہ دیا تو وہ ان تنگ کرتے سوالوں کے ساتھ ہی یونیورسٹی چلی گئی۔



”وہ یہاں تک چلا آیا ہے۔“

ڈاکٹر نینا نے اچھے کو بتایا۔ بریتی سارا دن نینا کے لیے فکر مند رہی تھی گھر آنے کے بعد بھی جب اس نے کمرے کا دروازہ لاک پایا تو اس کی فکر مندی دوچند ہو گئی۔ ڈاکٹر اچھے کے آنے کے بعد اس نے دبے دبے لفظوں میں اسے ماں کے بارے میں بتایا۔

”شاید ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، مجھے وہ کچھ ڈپریشن بھی لگیں۔“

”ڈپریشن اور نینا؟ امپا بل اوکے، میں دیکھتا ہوں۔“ اس کے ایک بار دستک دینے پر ہی دروازہ کھل گیا تو بریتی نے سکون کا سانس لیا۔

کچھ دیر بعد وہ کافی کے دو گلیے نینا کے کمرے تک گئی تو ادھ کھلے دروازے سے آتی اس کی خوفزدہ آواز نے بریتی کے دستک کے لیے اچھے ہاتھ کو روک دیا۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، کیا تم نے خود اسے دیکھا ہے؟“ نینا اس سوال کے جواب میں خاموش رہی تھی جس کا مطلب صاف تھا کہ وہ بریتی کا نام اس میں نہ لانا چاہتی تھی۔

”اگر آیا بھی ہے، تم نے دیکھا بھی ہے تو کیا فرق پڑتا

ہے۔ آیا ہو گا کسی کام سے اور فرق تو اس بات سے پڑتا ہے کہ کیا اس نے بھی تمہیں دیکھا ہے، پہچانا ہے؟“

”پتا نہیں، مگر وہ جان گیا ہے کہ ہم یہاں ہیں، وہ ہمیں ڈھونڈ نکالے گا، ہم تک پہنچ جائے گا وہ اچھے۔“ نینا کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ رورہی ہے۔ بریتی کے اندر مچلتے سوالوں میں کچھ اور اضافہ ہوا۔

”اتنے بڑے نیویارک میں وہ ہمیں کیسے ڈھونڈ سکتا ہے، اینڈ ڈونٹ لی سلی نینا! وہ ایسا کیوں کرے گا۔ اتنا فالتو سے کس کے پاس ہے کہ وہ پچیس سال پرانے سوال کا جواب جاننے کے لیے امریکہ تک چلا آئے۔ آیا ہو گا اپنے کسی کام سے۔“

”نہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے لیے ہی یہاں آیا ہے۔ وہ صرف ایک سوال نہیں ہے اچھے۔۔۔ وہ اس کے وشواس (اعتماد) کی بات تھی۔ وہ اپنے وشواس کے ٹوٹنے کا حساب مانگنے یہاں ضرور آئے گا اچھے! وہ ہم تک پہنچ جائے گا۔“

”یہ بات تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو۔ کہیں تم مجھ سے کچھ چھپاؤ نہیں رہیں؟۔“ وہ کھٹک گیا تھا۔ اب نینا کے پاس بتائے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”وہ دراصل۔۔۔ بریتی وہ مختار الیاسی، بریتی تک پہنچ گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے وہ اسے سب کچھ بتا نہ دے۔“

”بریتی اسے کیسے جانتی ہے؟“ وہی خوف جواب تک نینا کے لہجے میں تھا اب اچھے کے انداز میں بھی در آیا۔

”وہ اس سے کل پہلی بار ملی ہے بلکہ وہ ملا ہے۔ بریتی کی شکل مجھ سے ملتی ہے، اس لیے وہ فوراً پہچان گیا اور اس سے مزید تعارف لینے لگا۔“

”یہ تو بہت برا ہوا نینا۔۔۔ بہت برا۔“

”مجھے کچھ برا نہیں ہوا۔ بات اتنی آگے نہیں بڑھی۔ ہم اسے مزید برا ہونے سے روک سکتے ہیں ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔“

”ہاں اس سے پہلے کہ بریتی دوبارہ مختار سے ملے۔ ہمیں یہاں سے کچھ عرصہ کے لیے غائب ہو جانا



چاہیے۔ کل تم کسی بھی طرح پریتی کو گھر پہ روک لو۔  
میں پھٹی کے لیے کوشش کرتا ہوں۔“

”کل۔۔۔ کل تک تو بہت دیر ہو جائے گی، ہو سکتا ہے کل کا دن ختم ہونے سے پہلے پہلے پایا، ہمیں لے کے نیویارک سے نکل جائیں۔۔۔ اور واپس آنے تک مختار انکل انڈیا لوٹ جائیں۔ پھر میں کیسے جان پاؤں گی کہ مختار الیاسی کون ہے؟ اس کا میرے ماما پاپا سے کیا تعلق ہے؟ کیا پاپا کی پہچان وہ ہے جو میں جانتی ہوں یا وہ۔۔۔ جو مختار انکل بتاتے ہیں؟ مجھے ان سے ملنے سے کیوں روکا جا رہا ہے، ایسا کیا ہے جو مجھے نہیں جانتا چاہیے۔۔۔ کیوں خوفزدہ ہیں ماما۔۔۔ اور پاپا۔ کس لیے فرار ہو رہے ہیں ان سب سوالوں کا جواب مجھے جانتا ہی ہو گا اور اس کے لیے میں کل تک کا انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے آج ابھی اسی وقت نکلنا ہو گا۔“ وہ دروازے سے ہی پلٹ گئی۔



”انکل گھر پہ ہی ہیں حالانکہ آج ہمارا نیو جرسی جانے کا ارادہ تھا، لیکن نجانے کیوں انہیں لگتا تھا کہ کوئی نہ کوئی ان سے ملنے کے لیے آنے والا ہے۔“  
اس نے راستے میں فون کر کے ارباز سے ان کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا تھا۔

”اوپریتی! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ میں جانتا تھا کہ کل تم نے بھلے ہی میری باتوں کو سرسری لیا ہو، مگر تم آؤ گی ضرور۔۔۔ اپنے پاپا کے بارے میں جاننے کے لیے یہ جاننے کے لیے کہ وہ پچیس سال سے کس کس سے چھپ رہا ہے اور کیوں۔۔۔ مجھ سے، اپنے وطن سے، اپنے خاندان والوں سے۔۔۔ حتیٰ کہ خود اپنے آپ سے۔“

”آپ ان کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“

”تقریباً“ سب کچھ۔ اس کی اور میری دوستی کا آغاز آج سے تیس سال پہلے ہوا تھا۔۔۔ جب ہم تینوں میڈیکل کالج کے اسٹوڈنٹ تھے۔“  
”تینوں؟“

”ہاں تینوں، میں، مختار الیاسی۔۔۔ کلکتہ کے ایک مسلمان تجارت پیشہ گھرانے کا نوجوان۔۔۔ ابھیجیت مہادیون۔۔۔ تمہارا باپ، ناگ پور سے دہلی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہوا ایک کٹر برہمن مہاراشٹرین روایت پسند گھرانے کا اکلوتا بیٹا۔۔۔ مندی کھنہ، تمہاری ماں، چندی گڑھ کی ایک پنجابی فیملی کی خوب صورت، ذہین اور اکلوتی بیٹی۔۔۔ ہم تینوں دہلی میں پردیسی تھے۔۔۔ شاید یہی وجہ تھی کہ الگ الگ پس منظر رکھنے کے باوجود ہم اکٹھے ہو گئے۔ لیکن جلد ہی اس دوستی کی تکیوں نے ایک الگ رخ اختیار کر لیا جب ابھیجیت اور مندی کی دوستی محبت میں ڈھل گئی اور میں ان کی محبت کا واحد گواہ ہوں۔“



”ایشور کی کپا سے تمہارے امتحان اچھے ہو گئے۔ تم ڈاکٹر بن گئے تو میری آشا ہے کہ میں اور تمہاری ماں تیرتھ یا ترا کے لیے نکلیں گے۔“ سفید مہاراشٹرین لنگی پہنے، شانوں پہ جو گیارنگ کی چادر ڈالے، گلے میں مالا، کمر پہ زہار باندھے اور ماتھے پہ تلک لگائے، وہ اوم شیو مہادیون تھا، ٹھا کر اوم شیو مہادیون، ابھیجیت کا باپ۔

”تیرتھ یا ترا پہ نکلنے کا سے ابھی نہیں آیا تھی دیو۔“  
وہ پوچھا کر کے آیا تھا، اس کے ہاتھ سے پرشاد لیتے ابھیجیت نے چونک کے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

”ابھی ہم اپنی سنتان کے کرتویہ سے فارغ نہیں ہوئے۔ ابھی اس کا بیاہ کرنا ہے۔ کسی سندرسی بہو کو لا کے یہ گھر سجانا ہے۔ اس کے بعد نکلیں گے تیرتھ یا ترا کے لیے۔“ دیو دیوی نے وہ موضوع از خود چھیڑ دیا، جس پہ بات کرنے کے لیے ابھیجیت بھی بے چین تھا۔ اس بار وہ مندی سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ اپنے ماں باپ سے اس کا ذکر کرے گا، انہیں بتائے گا کہ وہ ان کے لیے بہو منتخب کر چکا ہے لیکن چار دنوں میں اسے ایک بار بھی موقع نہ مل سکا۔ اس کے گھر کا ماحول ایسا



نہ تھا کہ وہ بے تکلفی سے یہ موضوع چھیڑتا، وہ جھکتا ہی رہا جبکہ نندنی اپنے پایا ایڈوکیٹ منوج کھنہ کو اس کے بارے میں بتا چکی تھی۔ وہ تو اسے ان سے ملوانے کا ارادہ بھی رکھتی تھی۔ اس کے ماں باپ تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھے، قدرے ماڈرن طرز زندگی تھا ان کا۔۔۔ اس کے برعکس ابھیجیت کا گھرانہ سخت مذہبی تھا۔ اس کے باپ کو پوجاپاٹ اور زمینوں کے علاوہ کسی دوسری چیز میں دلچسپی نہ تھی، ماں ودیا دیوی ایک سیدھی سادی گھریلو ہندوستانی عورت تھی جس کی زندگی کا محور اس کا پتی اور بیٹا تھا۔ وہ دونوں اپنے اکلوتے بیٹے سے محبت تو بے پناہ کرتے تھے مگر دوستی نہ کر سکے۔۔۔ ایسی کوئی روایت ان کے ہاں نہ پائی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اب موقع ملنے پہ بھی ابھیجیت کی ہمت نہ ہو رہی تھی کہ وہ انہیں نندنی کے متعلق آگاہ کرے۔

”یہ بیاہ یہ راضی تو ہو پہلے۔۔۔“ اوم شیو نے بیٹے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ پچھلی لچھٹیوں میں بھی اس سے شادی کے متعلق بات کر چکا تھا لیکن ابھیجیت نے اگلے سال پہ ٹال دیا۔ دراصل وہ اپنی اور نندنی کی تعلیم مکمل ہونے کے انتظار میں تھا۔ اور اب یہ صحیح موقع تھا کہ وہ نندنی کا نام ان کے سامنے لیتا۔

”میں نے انکار کب کیا ہے پتا جی؟ صرف اتنا کہا تھا کہ میں اپنی پڑھائی پوری کر لوں۔ اب تو فارغ ہوں، آپ کی اچھا (خواہش) پوری ہونے کا سہ آں پہنچا ہے۔“ وہ نظریں جھکائے مسکرا رہا تھا۔

”ودیا دیوی! تمہاری منو کا منا (تمنا) پوری ہوئی۔ تمہارا سپوت تمہیں ساس بنانے پہ راضی۔۔۔“

”ٹھا کر جی! باہر منشی جی آپ کو بلارہے ہیں۔“ اتنے میں کسی نے آ کے اطلاع دی۔

”ہرے اوم۔۔۔ ہرے اوم۔“ وہ گفتگو ادھوری چھوڑ کے منشی سے ملنے چلا گیا۔ ابھیجیت کو یہ دخل اندازی سخت گراں گزری۔ وہ کچھ دیر بعد اسٹیشن جانے والا تھا، ناگ پور سے نکلنے کے لیے۔ اس لیے



”ماں! تم انہیں سمجھا سکتی ہو۔“

”میں ایسا کچھ نہیں کروں گی! بھیجیت! ہاں اگر تم ایسا کرو گے تو میں تمہارے لیے پرارتنا ضرور کروں گی کہ تم اپنے پتا کو منانے میں کامیاب ہو جاؤ۔“

”اچھا، تم ان سے بات تو کر سکتی ہو نا؟“ ماں کا تذبذب دیکھ کے اس نے مزید کہا۔ ”مت کرنا میری سفارش، صرف میری بات ان تک پہنچا دینا۔ پھر وہ چاہیں تو مجھ سے بات کر لیں۔ میں انہیں سمجھا لوں گا کہ ذات پات سب بے کار باتیں ہیں۔ سنسار ہیں اچھے لوگ، صرف برہمن ذات میں ہی نہیں ہوتے۔ نندنی سے اچھی لڑکی اس پر یوار کے لیے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔“ وہ ماں سے وعدہ لے کر سیدھا چندی گڑھ جا پہنچا جہاں نندنی نے اسے اپنی فیملی سے متعارف کرانے کے لیے بلوایا تھا۔

اگرچہ ناگ پور سے دہلی جا کے ہی وہ ایک نئی دنیا سے متعارف ہوا تھا جہاں سب کچھ اس کے قدامت پرست اور ریت رواجوں میں جکڑے خاندان سے یکسر مختلف تھا لیکن نندنی کے گھر کا ماحول اس کے لیے بالکل ایک نئی چیز تھا۔ وہ کھاتے پیتے خوشحال لوگ تھے۔ اعلیٰ تعلیم نے ذہنوں کو بھی وسعت بخش رکھی تھی۔ منوج کھنہ ایک خوش مزاج اور دوستانہ انداز رکھنے والا باپ تھا۔ اس کے ٹیپیکل پنجابی دادا دادی تک پہ روشن خیالی اور ماڈرن سوچ اثر انداز ہو چکی تھی۔ اس کی ماں، رتو کھنہ پاریسی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ دونوں کی لومیرج تھی اور انہوں نے ایک ہو جانے کے لیے مذہب کے اختلاف کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ رتو کھنہ پاریسی مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود اس ہندو گھرانے میں پوری طرح رچی بسی نظر آتی تھی شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ کھنہ فیملی مذہب کو دنیا کے ساتھ لے کے چلنے کی قائل تھی، مذہب ان کا اوڑھنا بچھونا نہیں تھا۔ مذہب ہی تہوار ان کے ہاں بھی پورے جوش و خروش اور عقیدت سے منائے جاتے تھے۔ نندنی کی دادی نے ہر ہندو گھرانے کی طرح گھر کے آئین میں مٹی لگا رکھی تھی۔ مندر بنار کھا تھا

چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے ساری بات ہو جائے۔ باپ کے جانے کے بعد اس نے ناچار ماں کو ہی صاف صاف سب کچھ بتانے کا ارادہ کر لیا۔

”ماں! تمہیں اپنی بہو تلاش کرنے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہاری بہو پسند کر لی ہے۔“

”تو نے؟۔۔۔ لیکن تیرے پتا۔“ وہ حیران رہ گئی۔ یہ تو اس نے سوچا تھا کہ اس کا بیٹا یہ کارنامہ خود انجام دے بیٹھے گا۔ ناگ پور جیسے چھوٹے سے قصبہ نما شہر کی اس قدیم حویلی میں اپنے کٹر مذہبی عقیدہ رکھنے والے شوہر کے ساتھ پوجا پاٹ اور گھرداری میں اک

عمر بتا دینے والی دویا دیوی نئے زمانے کے بدلتے تقاضوں سے اب تک انجان تھی۔

”ماں! پوچھو گی نہیں وہ کون ہے؟“ لیکن جواب میں ماں کے حیران و پریشان چہرے پہ اشتیاق کی کوئی رمت نہ پا کے وہ ذرا مایوس ہوا پھر خود ہی بتانے لگا۔

”اس کا نام نندنی کھنہ ہے۔ بہت سندر ہے وہ۔۔۔ ایک دم گوری۔۔۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں۔“

”کھنہ۔۔۔؟“ وہ نام پہ ہی اٹک گئی۔ ”تو کیا کنیا برہمن نہیں ہے؟“ یہ پہلا اعتراض تھا۔

”نہیں۔“ وہ شرمندہ ہوا جیسے اس میں سراسر قصور اس کا ہو۔

”لیکن وہ اچھے پر یوار کی ہے۔ چندی گڑھ سے تعلق ہے۔ اس کے پتا شری منوج کھنہ ایڈوکیٹ میرا مطلب ہے لوگوں کے مقدمے لڑتے ہیں بڑی عزت ہے ان کی سماج میں۔“

”عزت تو تمہارے پتا کی بھی بہت ہے اس سماج میں۔ کیا تم نے اس کا خیال کیا؟“

”میں نے کیا کیا ہے ماں؟“ اس نے انجان بنے رہنے میں ہی عافیت جالی اور حیرت کا اظہار کیا۔

”یہ تو تم اپنے پتا سے پوچھو، وہ کبھی کسی دوسری جات اور دوسری بھاشا کے پر یوار سے سمبندھ نہیں جوڑیں گے۔“ دویا دیوی نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا۔



کا موقع تک نہ دیا اور اپنی برادری کے درجن بھر معزز لوگوں کے انبوه میں اسے گھیر گھار کے گھر لے گئے۔ وہ ان کی موجودگی میں کوئی بات نہ کر سکا۔ مزید ہوش تب اڑنے جب باپ نے اس کے آگے نیا نکلور لباس پھینک کر تیار ہونے کا حکم دیا۔

”یہ... یہ کیا ہے؟“ وہ متوحش تھا۔

”تمہارے بیاہ کا جوڑا اور سہرا... ہم تمہاری بارات لے کے رائے پور جا رہے ہیں، اپنے دوست من موہن پنڈت کے ہاں من موہن پنڈت... ہمارے بچپن کا سنگی اب ہمارا سمبندھی ہے۔ ہم اسے وچن دے چکے ہیں اور اگر تم نے اس وچن کے پورا ہونے میں کوئی اڑچن (مشکل) پیدا کی تو بھگوان کی سوگندھ، ہم اپنے پران (جان) دے دیں گے۔“

وہ اس دھمکی پہ دم بخورہ گیا۔ شکوہ کنال نگاہوں سے ماں کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پہ بیٹے سے بڑھ کے بے بسی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی بیٹے کی اس خواہش کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی کہ ہرندو عورت کی طرح اسے بھی پتی کا ہر حکم مان لینے کا سبق گھول کر پلایا گیا تھا۔ اس کے لیے اس کا پتی ”پر میثور“ تھا اس کے خلاف جانا دیا دیوی کے لیے موت کے برابر تھا۔

ابھیجیت نے ایک نگاہ باپ کے چہرے پہ بھی ڈالی۔ یہ آخری نظر تھی جو اس نے کسی امید پہ اٹھائی تھی اس کے بعد قطعی مایوس ہو کے اس نے نظریں بھی جھکا لیں۔ اور سر بھی... اس نے خود کو مکمل طور پہ حالات کے اور اوم شیو مہادیون کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا کہ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہ تھا۔ اوم شیو کے پتھریلے چہرے پہ اس نے رحم، محبت اور نرمی کی ایک رمت تک نہ دیکھی تھی۔

یوں گوتمی پنڈت اس کی زندگی میں بن بلائے بن مانگے چلی آئی۔ وہ اپنے آپ سے، نندنی سے اور اس کے ساتھ کیے گئے وعدوں سے اتنا شرمندہ ہوا کہ پھر اس سے ملنے تک کی ہمت نہ کی، اس سے ہر رابطہ توڑ لیا۔ مختار الیاسی نے ہی نندنی کھنہ کو ابھیجیت کی اس زبردستی شادی کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد

لیکن مذہب کے معاملے میں اتنی سختی نہ تھی۔ ”تو“ ساس کی دیکھا دیکھی کبھی کبھار مہینے دو مہینے میں مندر چلی جایا کرتی تھی، منگل سوتر بھی پہنتی تھی اور سیندور بھی لگایا کرتی تھی، کرواچوتھ کا برت بھی رکھ لیا کرتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جس طرح وہ شادی سے پہلے گوشت اور انڈے استعمال کیا کرتی تھی، سسرال میں بھی اس پر روک ٹوک نہ تھی بلکہ منوج بھی چکن شوق سے کھانے لگا تھا۔ جبکہ ابھیجیت کے ہاں گوشت کا نام تک لینا گناہ تھا۔ وہ کسی ایسے گھر میں پالی تک نہ بیٹے تھے جہاں گوشت کھایا جاتا ہو۔ اسے نندنی کی فیملی کا دوستانہ اور کھلا ڈالا ماحول بے حد بھایا۔ منوج کھنہ نے بھی بھجیت ہونے والے داماد کے اسے اوکے کر دیا۔

نندنی سے بے شمار عہد و پیاں کر کے اور مستقبل کے بارے میں ان گنت خوش آئند خواب پلکوں پہ سجا کے وہ واپس دہلی پہنچا تو مختار اس کا منتظر تھا۔

”تمہارے پتا جی آئے تھے۔ تمہارے چندی گڑھ جانے کا میں نے تو نہیں بتایا مگر انہیں کسی نہ کسی طرح پتا چل ہی گیا اور کیسے نہ پتا چلتا جب کہ وہ ایک ایک سے تمہارے بارے میں معلومات لیتے پھر رہے تھے۔“

”میرے بارے میں؟ کیسی معلومات؟“

”نہ صرف تمہارے بارے میں بلکہ نندنی کے بارے میں بھی۔“ وہ یہ تو جانتا تھا کہ ماں سے نندنی کے متعلق علم ہونے کے بعد وہ اس سے بات کرنے کے لیے بے چین ہوں گے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ یہ بے تابی اس قدر شدید ہوگی کہ وہ اس کے ہاسٹل پہنچنے سے قبل خود آن پہنچیں گے۔

”انہوں نے تمہیں فوری طور پہ ناگ پور آنے کے لیے کہا ہے۔“ وہ ایک منٹ رکے بغیر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رستے بھر وہ اپنے باپ کے ممکنہ سوالات کے ایسے جواب تلاش تارہا جو کم سے کم قابل اعتراض ہوں (ان کی نظر میں)۔ ایسے دلائل گھڑتا رہا جن سے باپ کو مطمئن کیا جاسکے، لیکن اس کی نوبت ہی نہ آسکی۔ اوم شیو مہادیون نے اسے ٹرین سے اترتے ہی سنبھلنے



اپنا اثر نہیں کھوتا۔ ہر لحاظ سے ایک نئی زندگی شروع کرنے کی کوشش میں مصروف ابھجیت ایک بار پھر مایوس ہو گیا۔ گوتمی خود کو بدلنے پہ تیار نہ تھی۔ ابھجیت اسے اپنے لیے نہیں بدلنا چاہتا تھا، وہ ایسا رام دیو اور شام دیو کے لیے کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی اولاد اس کے دقیاوسی خاندان کی بھینٹ نہ چڑھے۔ مندی کو بھلا دینے کی ہر ممکن کوشش کرنے والا ابھجیت اب تک ذہن سے وہ خواب نہیں نکال پایا تھا جو اس نے مندی کے حوالے سے اپنی زندگی اور گھر کے لیے دیکھے تھے۔

ایک ہستے بستے خوشحال گھر کے۔۔۔  
ایک دوستانہ اور آزاد ماحول کے۔۔۔  
ایک متوازن سوچ و فکر والی زندگی کے۔۔۔  
اعلیٰ تعلیم یافتہ، خود اعتمادی سے مالا مال ذہن اولاد کے۔۔۔

مندنی اس کی زندگی میں نہ رہی، مگر وہ خواب جوں کے توں تھے۔۔۔ ان خوابوں کو وہ گوتمی۔۔۔ رام دیو اور شام دیو کے حوالے سے دیکھنے لگا۔  
دو سال گزر چکے تھے۔۔۔ اس کی کوششیں جاری تھیں۔ مگر نتیجہ۔۔۔؟

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

عمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ

ایئر پوسٹس

اب دو ہفتوں میں شائع ہو گئی ہے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، ۲۲، اردو بازار، کراچی

اس نے بھی مکمل خاموشی اختیار کر لی۔  
ابھجیت نے گوتمی کے ساتھ سمجھوتا کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس میں ایسا کچھ نہ تھا کہ وہ کسی مرد کو سب کچھ بھلانے پہ مجبور کر دے اور مرد بھی ابھجیت مہادیون جیسا، جس نے ایک لڑکی کو سچے دل سے چاہا۔۔۔ اور لڑکی بھی مندی کھنہ جیسی، جسے بھلانا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی تھا۔ مندی کے مقابلے میں گوتمی ایک دلی ہوئی شخصیت رکھتی تھی۔ اس کے گھرانے کا ماحول اوم شیو مہادیون کے ہاں سے کہیں بڑھ کے کٹر اور گھٹا ہوا تھا۔ وہ دیا دیوی کا دوسرا روپ بھی۔ وہی محدود سوچ، سہاسما، خود اعتمادی سے قطعی محروم انداز۔۔۔ واجبی سی شکل و صورت، معمولی ابتدائی تعلیم۔۔۔ اس کے پاس صرف ایک وصف تھا کہ وہ شدھ برہمن تھی، مہاراشرین تھی۔ جبکہ مندی کے بارے میں اوم شیو کا سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ وہ نہ صرف برہمن ذات کی نہ تھی بلکہ اس کے خون میں بھی ملاوٹ تھی، اس کی ماں سرے سے ہندو دھرم سے ہی نہ تھی۔ دیگر کئی اعتراضات بھی تھے جن میں سرفہرست اس کی آزاد خیالی تھی۔ اس کا ڈاکٹر ہونا بھی اس کی خامی گنا گیا۔ ابھجیت نہ تو اپنے باپ کو مندی کے لیے قائل کر سکا نہ ہی اس کی موت کی دھمکی کی وجہ سے گوتمی سے شادی کرنے سے انکار کر پایا۔ اس کے پاس اور کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ چپ چاپ تقدیر کے اس فیصلے کو قبول کر لے۔

اس نے ماں باپ کی خوشی کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پی لیا اور دوبارہ کبھی مندی کے سامنے نہ گیا اور وہاں جانے کے بجائے مدراس میں پریکٹس شروع کر دی۔ گوتمی کو بھی وہ ساتھ لے گیا تاکہ اس مندر نما حویلی سے دور رہے۔ شہر کی آزاد فضا میں اس کے ذہن پہ خوشگوار اثرات مرتب کر سکیں، مگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بائیس سالوں کی تربیت اور ماحول ہمینوں میں



# کی جلال کی سرحدیں

ڈاکٹر ایچے کا تعلق بھارت کی برہمن فیملی سے ہے۔ وہ اور اس کی بیوی فیینا کافی عرصے سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ دونوں ڈاکٹر میاں بیوی اپنے مذہب سے گہری عقیدت رکھنے کے باوجود ہندوستان سے وابستگی نہ ہونے کے برابر رکھتے ہیں۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی پریتی دیون ہے جسے ہندو کلچر سے بہت انیسیت محسوس ہوتی ہے لیکن وہ دوسرے مذاہب سے تعصب نہیں رکھتی جبکہ سارہ اکثر اسلام پر تنقید کرتی ہے۔ ڈاکٹر ایچے اس کا مسلمان دوستوں سے ملنا سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اس کے دوستوں کے گروپ میں نیلم سرور، سائرہ داؤد، ریچا سین، منصف علی تارڑ اور ارباز ایسا شامل ہیں۔ نیلم اور منصف کا تعلق پاکستان سے ہے جبکہ ریچا سین اور ارباز ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ سارہ داؤد نیویارک میں سارہ ڈیوڈ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ سارہ آدمی مسلم اور آدمی یورپین ہے۔ یہ سب آپس میں بہت ربط مضبوط رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تقریبات اور تہوار میں شریک ہوتے ہیں لیکن پریتی پر صرف مسلمانوں کے تہوار میں شریک ہونے پر سخت پابندی ہے۔ وہ گھر والوں کو بتائے بغیر عید کے تہوار کی دعوت میں شریک ہوتی ہے تو ڈاکٹر ایچے شدید ناراض ہو جاتا ہے۔

پریتی اکثر ایک خواب دیکھتی ہے۔ خواب میں وہ اذان کے کلمات سنتی ہے۔ وہ فیینا سے پوچھتی ہے تو فیینا پریشان ہو جاتی ہے۔

پریتی اپنی ماں ڈاکٹر فیینا سے ہندوستان کے بارے میں دریافت کرتی ہے تو وہ استہزائی ہے کہ ایچے اور اس کا باپ





والدین کی مرضی کے خلاف مندر میں ہوا تھا کیونکہ ان دونوں کی ذات برادری مختلف تھی اور اس خطا کو ابھی کے والدین نے مرتے دم تک معاف نہ کیا۔ ڈاکٹر ابھی اس غم میں ہندوستان نہیں لوٹنا چاہتا۔  
 منصف میں سارہ ڈیوڈ کیسی لیتی ہے لیکن منصف اسے ٹھکرا دیتا ہے۔ منصف پریتی میں کشش محسوس کرتا ہے لیکن واضح اظہار نہیں کرتا۔ پریتی بھی منصف کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے۔ نیلم کی منگنی کی تقریب میں پریتی کی ملاقات مختار الیاس سے ہوتی ہے۔ جو ابھی ابھی ہندوستان سے آئے ہیں۔ مختار الیاس پریتی سے متعارف ہونے کے بعد اس پر انکشاف کرتے ہیں کہ وہ اس کے والدین کے دوست رہ چکے ہیں جس پر اسے شدید حیرت ہوتی ہے۔ مختار الیاس کا ذکر جب وہ اپنی ماں یعنی مسزیننا سے کرتی ہے تو وہ بھی یہ نام سن کر پریشان ہو جاتی ہے۔  
 دوسری ملاقات میں مختار الیاس اسے بتاتے ہیں کہ وہ اس کے والدین کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔ وہ ان کے کلاس نیو رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر ابھی کا اصل نام ابھیجیت ہے جسے میڈیکل کی طالبہ مندی سے محبت ہو گئی تھی مگر ذات برادری مختلف ہونے کی وجہ سے ابھیجیت کے والدین نے اس کی شادی گومی سے کر دی۔

## ۲ دوسری اور آخری قسط

اپنا وجود منسلک نہ ہوتا۔ میں اس کہانی کا ایک ایسا کردار ہوں پریتی! جسے خود بھی پتا نہیں چلا کہ اس ساری کہانی میں اس کی جگہ کہاں تھی۔  
 ”آپ؟“

”ہاں میں، ابھیجیت نے دہلی ضرور چھوڑا مگر مجھ سے رابطہ نہ توڑا۔ گومی پنڈت سے اپنی زبردستی کی شادی کے بعد وہ مدراس اسپتال ہو گیا تھا۔ مندی کھنہ اپنے آبائی شہر چندریگرہ میں ہی تھی جبکہ مجھے بمبئی میں جاب مل گئی۔ ہمارا وہ تھکون بکھر گیا جو میڈیکل کالج میں ایک مثال مانا جاتا تھا لیکن تقدیر ہم تینوں کو پھر ایک جگہ پہ لے آئی۔ اپنی شادی کے دو سال بعد ابھیجیت اسپیشلائزیشن کے لئے ممبئی آیا اور اس ہاسٹل کو جو ان کر لیا جہاں میں ہوتا تھا۔ اسے آئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ مندی وہاں چلی آئی۔ شاید اسے محبت کی کشش کھینچ لائی تھی۔



ابھیجیت مہادیون ناگ پور سے کئی گھنٹوں کے تھکا دینے والے سفر سے واپس آیا تھا۔ بمبئی آنے کے بعد گومی مدراس میں اکیلے رہنے پر راضی نہ تھی۔ یوں

”رام دیو اور شام دیو۔“  
 پریتی حیرت سے کہہ اٹھی۔ مختار الیاس اپنا چشمہ اتار کے صاف کیا۔

”میں جانتا ہوں یہ حقیقت تمہارے لیے خاصی تکلیف دہ ہے مگر یہ حقیقت تمہیں تسلیم تو کرنا پڑے گی۔“

”میں کیسے مان لوں کہ یہ سچ ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے بہکانے کے لیے نہیں شاید آپ میرے ماما اور پاپا کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنا چاہتے ہیں آپ ان کا ریلیشن شپ کمزور کرنا چاہتے ہیں لیکن ایسا ہو گا نہیں۔“ اب تک اشتیاق سے اپنے ماں باپ کا ذکر سنتی پریتی دیون ڈاکٹر ابھی کی ایک اور بیوی اور دو بچوں کا ذکر سنتے ہی ہتھ سے اکھڑ گئی۔

”پریتی! تم انکل کی بات تو سن لو۔ انہیں کیا ضرورت ہے کہ وہ تمہارے پیرکس کے بارے میں گمراہ کن باتیں کر کے تمہیں الجھا میں۔ وہ جھوٹ کیوں بولیں گے؟“ ارباز نے اسے روکنے کی غرض سے کہا۔

”جھوٹ تو ایک طرف بیٹا! مجھے سچ بولنے کی بھی کوئی ضرورت نہ ہوتی اگر اس سارے قصے سے میرا



قریب ہونے کا سن کے محل اٹھا تھا۔

لیکن اس نے اپنے آپ کو سمجھالیا۔ میں اپنے ماما پتا کے ساتھ ساتھ اب گوئی رام دیو اور شام دیو میں بھی بٹ چکا ہوں۔ مجھے اب اس کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ لیکن ساری سمجھ بوجھ دھری کی دھری رہ گئی جب اس کا واپسی میں نندنی کھنہ سے سامنا ہوا۔

وہ دیکھ کر ایسی تھی بلکہ پہلے سے بڑھ کے حسین لگ رہی تھی۔ سادہ تو وہ پہلے بھی رہا کرتی تھی، بلکہ رنگوں کے پنجابی شلوار سوٹ میں ملبوس لیکن اب پہلے رنگ کی سادہ ساڑھی پہ سفید اوور آل پہنے وہ بہت باوقار بھی لگ رہی تھی۔

”کیسی ہو نندنی؟“ اس نے نارمل رہنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل پہلے جیسی۔“ وہ مسکرائی۔ لیکن مسکراتے سے اس کی آنکھیں پہلے کی طرح چمک نہیں اٹھی تھیں۔ ابھیچیت نے ان سر می آنکھوں کو بچھا ہوا سا محسوس کیا تو کہہ اٹھا۔

”نہیں تم پہلے جیسی نہیں ہو بہت بدل گئی ہو۔“  
”کیا۔ کیا مطلب؟“ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

”مطلب یہ کہ پہلے سے زیادہ سندر ہو گئی ہو۔“  
ابھیچیت نے بات بدل دی۔

تو وہاں شروع سے ہی اس کا دل نہ لگا تھا لیکن اپنا من مار کے صرف اس کی خاطر وہاں رہتی آئی تھی۔ بمبئی تک لانا ابھیچیت نے خود مناسب نہ سمجھا۔ دو سال میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ گوئی کے ساتھ شب و روز گزارنا اس کے لیے اتنا خوشگوار امر نہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی پڑھائی یکسوئی کے ساتھ کر سکے۔ دوسری طرف اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ اس کے بچے ماں کے زیر سایہ ناگ پور جیسے قصبے میں اور اس کے آبائی گھر کے گھٹے ہوئے ماحول میں نئے زمانے کے تقاضوں سے بے بہرہ نہ رہ جائیں۔ اس نے مکمل ارادہ کر لیا تھا کہ اسپیشلائزیشن مکمل ہوتے ہی وہ فیملی کو وہاں بمبئی میں ہی بلوالے گا۔ اس وقت تک کے لیے اسے بمبئی میں اکیلے ہی رہنا تھا اور اوم شیو مہادیون کے حکم کے مطابق ہر مہینے ناگ پور میں بیوی بچوں سے ملنے کے لیے بھی جانا تھا۔

اس دن اسپتال پہنچتے ہی مختار الیاسی نے اسے خبر دی تھی۔

”مہیسر پتا ہے، نندنی، نندنی کھنہ ہمارے ہاسپتال میں اپائنٹ ہو گئی ہے۔“

ابھیچیت کے منہ سے ”کون نندنی کھنہ؟“ نکلتے نکلتے رہ گیا۔

ان دو سالوں میں اس نے خود کو یہ دھوکا دینے کی

اتنی بھرپور اور مسلسل کوشش کی تھی کہ نندنی اب ایک بھولی بیری یاد بن کر رہ گئی تھی۔

”چھاتو پھر؟“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔  
”تو پھر؟“ مختار حیرت سے اس کے لفظ دہرا کے رہ گیا۔

”تو پھر کیا؟ تم اس سے ملو گے نہیں؟“  
”جب ہم کبھی مل ہی نہیں سکتے مختار تو پھر مل“  
کے کیا کریں گے۔“ وہ پھسکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو مختار خاموش ہو گیا۔

لیکن ابھیچیت اپنے دل کو خاموش نہ کر سکا۔ جو نندنی کھنہ کے اس شہر میں اسی ہاسپتال میں اس کے اتنے

عمران داتجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ

ایز بوسٹس

اب دو حصوں میں شائع ہو گئی ہے

مکتبہ عمران داتجسٹ، ۴۴، اردو بازار، کراچی



”اور یہ تم ساڑھی کب سے باندھنے لگیں؟“  
 ”کیوں ساڑھی اچھی نہیں لگ رہی مجھ پر؟“  
 ”تم پہ تو سب کچھ ج سا جاتا ہے نندنی۔“ وہ بے  
 ساختہ کہہ اٹھنے کے بعد خود ہی شرمندہ سا ہو گیا۔ اب  
 وہ اس کے سر اے کو سراہنے کا اختیار کھو چکا تھا۔ نندنی  
 کے تاثرات بھی کچھ الگ نہ تھے۔  
 ”تمہاری پتی کیسی ہے؟“ اگلی ملاقات میں نجانے  
 کس دل سے۔۔۔ اور کتنی ہمت کے بعد وہ یہ پوچھ رہی  
 تھی۔

”اچھی ہے مگر تم سے زیادہ نہیں۔“ وہ ہنس پڑا۔  
 ”فلٹر کرنے کی عادت نہیں گئی۔“ اس نے سر  
 جھٹکا۔

”تم سے اچھا کوئی ہو بھی کیسے سکتا ہے؟“  
 ”جھوٹ۔ ایسا ہوتا تو کوئی اور میری جگہ لیتا کیسے؟“  
 پہلی بار وہ یہ شکوہ کر بیٹھی، بظاہر مذاق میں کسی اس  
 بات کے پیچھے کتنا درد چھپا ہوا تھا، اس کا اندازہ اس کی  
 بھیگی پلکوں اور ٹوٹے لہجے سے بخوبی ہو رہا تھا۔ وہ چپ کا  
 چپ رہ گیا۔

”اور تمہارے بچے؟“ نندنی نے سر جھٹک کے  
 اس کیفیت سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔ مختار تاربا  
 تھا۔ ”تمہارے دو بیٹے ہیں۔“

”ہاں، بہت پارے ہیں۔ ایک تو ابھی دو ہفتوں کا  
 ہے، اسی لیے گونبی دیں ناگ پور میں رہتی ہے،  
 میرے ساتھ بمبئی نہیں آئی۔“

”ورنہ تم اس کے بغیر ایک دن نہیں رہ پاتے، یہی  
 کہنا چاہتے ہونا؟“ اس نے شرارت سے چھیڑا لیکن  
 وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”نہیں، میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا۔ میں یہ بھی  
 نہیں کہوں گا کہ میں گونبی کے ساتھ بہت خوش ہوں،  
 مطمئن ہوں، میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ مجھے اپنے  
 جیون سے کوئی شکایت نہیں، نہ ہی یہ کہوں گا کہ  
 تمہارے بنا بھی جیون گزر رہی جائے گا، میں ایسا کچھ  
 بھی نہیں کہوں گا، نندنی کیونکہ میں تمہارے ساتھ  
 سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

”ہاں، تم سب کچھ کر سکتے ہو میرے ساتھ، مجھ سے  
 کیے وچن توڑ سکتے ہو، میرے سنے توڑ سکتے ہو، میرا دل  
 توڑ سکتے ہو، ہماری محبت کا رشتہ توڑ سکتے ہو، صرف مجھ  
 سے جھوٹ نہیں بول سکتے۔“ یہ دوسرا شکوہ تھا، جس کا  
 کوئی جواب اب بھیجیت کے پاس نہ تھا۔ اس کا جھکا ہوا  
 سر دیکھ کے نندنی کو افسوس ہوا۔

”سوری ابھیجیت، ان سب میں تمہارا کیا دوش۔  
 شاید وہ دھاتانے ہمارا سنجوگ ہی نہ لکھا ہو۔“

اس نے ابھیجیت کو پوری شدت سے چاہا تھا۔ وہ  
 اس کی جھکی ہوئی نظریں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے  
 شرمندگی سے بچانے کے لیے ہی پہلے پہل وہ اس کے  
 ساتھ مقدور بھرنا مل اور دوستانہ انداز میں ملتی رہی۔  
 لیکن۔

یہ دوستانہ سی، بے ضرر سی ملاقاتیں جلد ہی ایک  
 اور روپ اختیار کر گئیں، وہ خود کو محبت کے اس  
 دوسرے مگر کاری وار سے پہچانے سکے۔

”پہلے تمہارے بنا جینا مشکل لگتا تھا نندنی، لیکن  
 اب ناممکن۔“ جلد ہی ہار مان کے وہ اعتراف کر بیٹھا۔  
 اور وہ بھی اس کے ہاتھ پر چہرہ ٹکا کے سسکا اٹھی۔  
 اس کے آنسو ابھیجیت کو اندر تک بھگونے لگے۔  
 اس کے ارد گرد کھڑی فسیلوں کی بنیادیں گیلی ہو کے  
 کمزور پڑ گئیں۔ کوئی وقت جاتا تھا کہ وہ بھر بھری مٹی کی  
 طرح ڈھے جاتیں۔  
 اور وہ وقت بھی آن پہنچا۔

”میری ماما کو تم سے میرا ملنا پسند نہیں ابھی!“ نندنی  
 نے اس سے کہا تھا۔ ایڈوکیٹ منوج کھنہ پچھلے سال  
 بھارت اٹیک میں گزر چکا تھا اور رتو کھنہ ایک روایتی  
 ہندوستانی ماں کا روپ اختیار کر چکی تھی۔  
 ”مگر کیوں؟“

”کیونکہ تم ایک میڈیٹیشن ہو۔ تم مجھے سوائے  
 بہلاؤں اور تسلیوں کے اور کچھ نہیں دے سکتے۔“  
 نندنی نے سچ بیان کیا۔ ”اور ایک کنواری جوان لڑکی کی  
 ماں کو بہلاوے اور تسلی نہیں، کچھ اور چاہیے ہوتا  
 ہے۔ جو ایک بیاہتا مرد اسے نہیں دے سکتا۔“



لیبل لگے۔ میں اسے اور کچھ نہیں دے سکتا تو کم از کم ذلت اور بے عزتی سے تو بچا سکتا ہوں۔

”تو تمہیں کون کہہ رہا ہے کہ تم دو دیویاں رکھو۔ گوتمی سے نہ تو تمہیں محبت ہے نہ ہی تمہارا اس سے گزارا ممکن ہے تو پھر طلاق دے دو اسے۔“ اس مشورے پر نندنی تڑپ اٹھی۔

”نہیں، بھگوان کے لیے ایسا مت کرنا۔ اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔ اس نردوش کی کوئی بد دعا مجھے لگ گئی تو کیا ہو گا؟“

”افوہ! ایک تو نندنی، تمہارا یہ میلو ڈرامہ۔“ مختار تنگ آگیا۔

”پتا نہیں تم دونوں کیا چاہتے ہو؟ کس زمانے میں بستے ہو۔ محبت بھی کرتے ہو، ایک بھی ہونا چاہتے ہو اور زمانے سے ڈرتے بھی ہو۔ یار، تم لوگوں نے منغل اعظم نہیں دیکھی کیا وہ سبق نہیں پڑھا۔۔۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔“

”ششاپ مختار! زندگی کوئی کے آصف کی بنائی کاسیوم مودی نہیں جس کے ہر سین پہ لوگ واہ واہ کریں۔ ہمارا ایک بھی غلط قدم ہمارے پر یوار والوں کے لیے دکھ کا کارن بن سکتا ہے۔“ ابھیجیت نے اسے جھڑک دیا۔

”اور تمہارے ان پر یوار والوں نے تمہیں سوائے دکھ کے اور کیا دیا ہے؟ میری مانو، تو ایک بار پھر اپنے راستے الگ کر لینے سے پہلے اتنا ضرور سوچو کہ قسمت نے تمہیں دوبارہ ملایا ہے تو یہ بلا جواز نہیں ہو گا۔ تقدیر کے اس اشارے کو سمجھو۔“ وہ انہیں دعوتِ فکر دے گیا۔

”مختار جذباتی ہے۔ تم اس کی باتوں میں آکے ڈالٹی درس کا تو سوچنا بھی مت۔ میں ایسا بالکل نہیں چاہتی۔ تمہارے ہشتے بستے گھر کو اجازت امیرے لیے پاپ ہو گا۔“ نندنی نے پھر سے سمجھایا چاہا۔

”ہنستا ہنستا گھر؟“ وہ مسخرے ہنکارا بھر کے رہ گیا۔

”کیسا ہنستا ہنستا گھر نندنی! گوتمی میں اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے، ہماری تو سوچ اور ذہن کا ملنا بھی

”اور تم نندنی! تمہیں کیا چاہیے؟“

”میں۔۔۔ وہ خود پہن دی۔“ مجھے تو تم بہلاوے تک نہ دو، تب بھی منظور ہے۔ لیکن ابھی میں ماما کو دکھی نہیں کر سکتی۔“

”پاں، تم نے بھی ایک وقت میں میری مجبوری سمجھی تھی۔ میرے پتاجی کا مان رکھنے کے لیے میری زندگی سے چپ چاپ نکل گئی تھیں۔ آج میں یہ حساب چکاڑتا ہوں نندنی! آج میں رتو آنٹی کی آگیا کا مان رکھتے ہوئے تمہیں اپنی محبت سے ملتی دیتا ہوں۔ تم ان کی پسند کے کسی اتھھے سے لڑکے سے بیاہ کر لو۔“

”لیکن سوال یہ ہے ابھیجیت کہ کیا میرا دل اس ”ملتی“ کو قبول کرتا ہے؟ نہیں ابھی! بالکل نہیں۔ میں نے ایک بار کھوکے تمہیں پایا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ یہ دو سال میں نے تمہارے بغیر کیے کائے ہیں۔ اب میں کسی قیمت پر بھی تم سے الگ نہیں ہو سکتی۔“

”لیکن تمہاری ماما، میں انہیں دکھ نہیں دیتا چاہتا۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”وہ تو میں بھی نہیں چاہتی۔ سوچا ہے اب ان سے چھپالوں گی کہ ہمارا کوئی سمبندھ بھی ہے۔“

”ایسا کب تک چلے گا؟“ اس کے سوال پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ مختار الیاسی سے اس مسئلے کا ذکر کیا تو وہ جھوٹے ہی بولا۔

”میں تو تم دونوں کو یہ مشورہ دوں گا کہ پہلی فرصت میں شادی کر لو۔ دیکھو یار! تمہارے پتاجی نے تمہاری مرضی کے بغیر اپنی پسند سے تمہاری شادی کی۔ اب تم ان کی مرضی کے بغیر اپنی پسند سے شادی کر لو۔ خفیہ رکھ لو۔ وہ وہاں ناگ پور میں، تم بمبئی میں کیسے پتا چلے گا؟“

”میں نہیں اتنا بے خبر مت جانو، پتہ چل گیا تو زمین آسمان ایک کر دیں گے ویسے بھی میرا نندنی سے بیاہ اب ناممکن سی بات ہے۔ تمہارے تایا کی طرح میں دو دیویاں نہیں رکھ سکتا۔ پہلی بیوی کے ہوتے دوسری شادی قانوناً اور مذہباً ناجائز ہوگی اور میں نہیں چاہتا کہ میری اور نندنی کی پاک محبت پر کسی ناجائز رشتے کا



ناممکن کی بات ہے، دلوں کے ملنے کی بات تو تم جانے ہی دو۔ میں کچھ عرصہ اور اس کے ساتھ رہا تو بھگوان کی سوگندہ یاگل ہو جاؤں گا۔ من پسند ہستی کا حاصل نہ ہونا جتنا تکلیف دیتا ہے، اتنا ہی تکلیف دہ ناپسند ہستی کے ساتھ جیون بیتانا بھی ہوتا ہے۔“

”لیکن تمہارے بچے وہ بہت چھوٹے ہیں، ان کا کیا دوش ہے۔ میری نظر میں تو تمہاری پتی بھی نرودش ہے مگر۔۔۔ مگر وہ بچے ابھیجیت کیا ان کے لیے بھی تمہارے دل میں کچھ نہیں۔ میں ان بچوں سے ان کا پتا چھین کر اپنی باقی زندگی ایک احساس جرم کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔“

”وہ میرے بچے ہیں اور ٹھا کر اپنا دلش کبھی نہیں چھوڑتا۔ ان کے نام کے آگے میرا نام سدا لگا رہے گا اور ان کے جیون کے ساتھ بھی جڑا رہے گا۔ تم چتا مت کرو۔ میں ان کی جانب سے کوئی بے پروائی نہیں کروں گا۔“

کئی دنوں کی مسلسل بحث و تمحیص کے بعد دونوں اس بات پہ متفق ہو ہی گئے کہ تقدیر کے کیے اس دوسرے ملاپ کو وہ ایک بار پھر جدائی میں بدلنے نہیں دیں گے۔ اور ابھیجیت کو گوئی سے علیحدگی اختیار کرنا ہی پڑے گی۔

ابھیجیت نے اگلے ہی دن مختار کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

”ارادہ کر ہی لیا ہے تو اب قدم پیچھے مت ہٹانا۔ جتنی دیر کرو گے، ہمت اتنی ہی کمزور پڑتی جائے گی۔ میری مانو تو کل کی بات چھوڑو، ابھی اسی وقت میرے ساتھ وکیل کی طرف چلو۔“

”وکیل؟“ ابھیجیت اس مشورے پہ یوں چونکا، جیسے کوئی گہری نیند یا تصور سے ہڑبڑا کے جاگ اٹھا ہو۔ اس کے چہرے پہ تفکر کی سیاہ پرچھائیاں چھا گئیں۔

”نہیں۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ امپا سبل۔۔۔ یہ تو بہت مشکل۔۔۔ نہیں، نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی نہیں ہو گا۔۔۔ وہ بھگوان میں نے یہ کیوں نہیں سوچا۔“ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں پہ گرائے تاسف سے بدبڑا رہا

تھا۔

”کیا بات ہے ابھیجیت؟“ مختار بھی کھٹک گیا۔

”یہ ڈائی ورس نہیں ہو سکتی۔“ اس نے بے حد شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

”کیوں؟ کیا تمہیں گوئی کی وجہ سے خطرہ ہے کہ وہ تمہیں طلاق دینے کے لیے آنا کافی کرے گی؟“ نندنی کے قیاس پہ مختار جھلا گیا۔

”یہ اچھی مصیبت ہے یعنی اب گوئی صاحبہ روڑے اٹکائیں گی، طلاق دینے سے انکار کریں گی۔“

”یہ اس کا حق ہے مختار! وہ دو سالوں سے ابھی کی دھرم پتی ہے۔ اس کے بچوں کی ماں ہے، من

ابھیجیت کا بدلا ہے، اس کا نہیں۔ یہ کہیں اور شادی کرنا چاہتا ہے تو ضروری نہیں کہ گوئی بھی اس شادی کو توڑنا چاہے۔“ نندنی نے صاف گوئی سے کہا۔

”یہ تمہارے دھرم کا قانون نہیں کہ جب چاہو، عورت کو کھڑے کھڑے تین لفظ کہہ کے طلاق دے دو

چاہے وہ بیچاری لینا چاہے یا نہ چاہے۔“

”تم اس بارے میں دس فیصد بھی نہیں جانتیں، اس لیے یہ بحث جانے دو۔ اسلام میں طلاق دینے کا

عمل اتنا بھی بے رحمانہ اور جانب دار نہیں جتنا کہ چند لاعلم قسم کے مردوں کی وجہ سے مشہور ہو چکا ہے۔

ہمارے مذہب میں بھی عورتوں کے لیے بہت سے حقوق اور آسانیاں ہیں۔ انہیں بھی خلع لینے کا حق دیا

گیا ہے جبکہ دوسری طرف تمہارا ہندو دھرم ہے جس میں ایک جائز کام کے لیے بھی مشکلات کا سامنا ہے۔“

مختار نندنی پہ برس پڑا، پھر اس نے ابھیجیت پہ توجہ کی، جواب تک سر نہ ہواڑے بیٹھا تھا۔

”تم چلو تو سہی، مشکل ہے ناممکن تو نہیں۔ شر قابل و کیلوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ کچھ ایسے قانونی داؤ

پیچ کھیلیں گے کہ گوئی کو طلاق دیتے ہی بنے گی۔“

”وہ تو بعد کی بات ہے، قانونی داؤ پیچ کھیلنے کی نوبت تب آئے گی جب معاملہ قانون کی حد میں ہو گا۔“

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“

”مطلب یہ کہ تم جانتے ہی ہو گے کہ ہمارے دھرم



میں طلاق سرے سے ہے ہی نہیں۔ ایک بار جس کے ساتھ سات پھیرے لے لیے، پھر موت ہی اس سے نانا توڑ سکتی ہے اور چونکہ ہندو دھرم میں پتی مرتے دم تک آپ کی پتی ہی رہتی ہے اس لیے اس کی زندگی میں تو دوسری شادی ممکن نہیں۔ یہ دھرم کے لحاظ سے باپ اور قانون کی نظر میں جرم ہو گا۔ اس نے مختار کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔

”اسی لیے تو میں نے طلاق لینے کا مشورہ دیا تھا تمہیں۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ انڈین ہندو ایکٹ کے تحت ایک وقت میں دو بیویاں رکھنا قابل تعزیر جرم ہے۔ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کی کوئی حیثیت ہی تسلیم نہیں کی جاتی اور نہ ہی یہ رشتہ جائز کہلاتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ قانون نے یہ رعایت دے رکھی ہے کہ کسی وجہ سے اگر دونوں الگ ہونا چاہیں تو طلاق لے سکتے ہیں۔“

”ہاں، لیکن یہ رعایت قانون نے دی ہے، دھرم نے نہیں۔ قانون کی اس رعایت سے فائدہ صرف وہ لوگ اٹھا سکتے ہیں جن کی شادی بھی قانونی طریقے سے ہوئی ہو۔“

”تو کیا تمہاری شادی غیر قانونی ہے۔ آئی مین ال لیگل ہے؟“ مختار نے ہونق پن سے پوچھا۔

”نہیں یار۔۔۔“ وہ جھنجھلا گیا۔ ”ہندو دھرم کے سارے قاعدے نبھاتے ہوئے شادی کرنے کے بعد اپنی شادی کو کورٹ میں جا کے رجسٹر کروانے کے بعد ہی شادی قانونی ہوتی ہے اور اس کے بعد ہی انسان اپنی شادی سے متعلق فیصلے قانون کے مطابق لے سکتا ہے۔ بڑے شہروں میں ایسا ہی ہوتا ہے، پھیرے لینے کے بعد۔۔۔ یا چند روز کے بعد لوگ وکیل کی مدد سے کورٹ میرج بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن ابھی چھوٹے شہروں میں ایسا رواج نہیں ہوا۔ ہم نے بھی وکیل، جج اور گواہوں کی موجودگی میں رجسٹرپہ سائن کرنے کے بجائے اگنی کے سامنے پھیرے لیے تھے۔ ہماری شادی دھارمک ہے، اس پہ دھرم کے قانون لاگو ہوتے ہیں۔ انڈین ایکٹ کی زد میں ہمارا رشتہ نہیں آ سکتا۔“ اس



نے حقیقت بیان کی جسے جان کر مختار چپ کا چپ رہ گیا۔

ہاں ابھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ انڈیا ایک سیکولر دیش ہے۔ یہاں لاء بھی سب کے لیے ہے۔ انڈیا ایکٹ ہے۔ ہندو ایکٹ اور مسلم لاء ایکٹ۔ جس کے تحت ویش میں رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کے لیے فیصلے ان کے دھرم کے قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ ”نندنی نے بصرہ کیا۔“

”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“  
”نہیں اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“ مختار کی آنکھیں یکایک چمکنے لگیں۔ نندنی کی بات نے اسے ایک نئی راہ سمجھا دی تھی۔



”تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے مختار!“  
اس کی تجویز سن کر ابھیجت ہتھ سے ہی اکھڑ گیا۔ نندنی کی حالت بھی مختلف نہ تھی مگر وہ ابھیجت کی طرح مختار پہ برسنے کے بجائے صرف اسے طامت بھری نظروں سے دیکھ کے رہ گئی۔  
”چلو بونی سہی۔ مگرنی الوقت تمہارے مسئلے کا اس سے بہتر اور کوئی حل ہو ہی نہیں سکتا۔“

”پلیز مختار! تمہیں دوست جان کر اگر ہم اپنی پرسنل پراہلنزم سے ڈسکس کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ان کا مذاق بناؤ الو۔“ نندنی نے خفگی دکھائی۔

”یار! میں نے ایسا بھی ناقابل عمل حل پیش نہیں کیا جو تم اسے کوئی بھونڈا مذاق سمجھ بیٹھے ہو۔ آئی ایم ڈیم سیریس۔“ مختار نے اپنی سنجیدگی کا یقین دلانا چاہا۔  
”کسی کو سنجیدگی سے اس کا دھرم بدل لینے کا مشورہ دینا یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟“ نندنی نے کہا۔ جبکہ ابھیجت خاموش رہ کے اپنے اندر اٹھتے طیش کے ابال کو دبانے میں مصروف تھا۔

”اور مذہب زندگی کی سب سے بڑی اور جائز خواہش سے ٹکراتا ہو تو؟“

”یہی بات تم اپنے دل سے پوچھو مختار! اگر تمہارے دھرم کی کسی پابندی پہ تمہارا دل نہ مانے تو کیا تم اپنا دھرم بدل لو گے۔۔۔۔۔ صرف اپنے دل کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنے کے لیے۔“ ابھیجت نے بیچتا ہوا سوال کیا۔

”صرف بڑی نہیں ابھی۔۔۔ میں نے کہا، جائز خواہش۔“ اس نے اپنے الفاظ دہرائے۔

”ہمارا دین فطرت انسانی کی کسی جائز خواہش سے نہیں ٹکراتا۔ یہ انسانی جبلت اور فطرت کے اصولوں کے عین مطابق وضع کیا گیا ہے۔ اس میں بھی پابندیاں ہیں، بہت سی ممنوعات ہیں مگر کسی جائز فعل کی راہ میں دیوار نہیں کی گئی۔ جبکہ تمہارے مذہب میں بیوہ کی دوسری شادی۔۔۔ ایک وقت میں مردوں کا دوسریوں رکھنا مطعی حرام ہے، حالانکہ بعض حالات میں یہ نہ صرف ناگزیر ہو جاتا ہے بلکہ اسی میں بھلائی چھپی ہوتی ہے۔“

”لیکن اس کے علاوہ بھی تو اس کا کوئی حل ہو گا کہ ہم مسلمان ہو جائیں۔“

”میرے دادا، پردادا ہندوستان تبلیغ کا کام کرتے آئے ہیں، میرا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے لیکن اس کے باوجود میں نے نہ صرف تم دونوں بلکہ اور بھی بہت سے غیر مسلموں سے دوستی رکھی، اور اس دوستی کے درمیان کبھی مذہب کو حائل نہ ہونے دیا۔ غیر مذہب کے دوستوں کی صحبت نے اور سیکولر ازم کے دلفریب نعروں نے میری اس سوچ کو پختہ کر دیا تھا کہ ہر فرد اپنے مذہب کے بارے میں آزاد ہے اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کے مذہب پر نکتہ چینی کرے۔ لیکن اب کچھ عرصے سے خصوصاً ”جمہی“ آنے کے بعد اور یہاں کے حالات سے واقف ہونے کے بعد میری سوچ بدلنے لگی ہے۔ تفصیل میں نہیں جاتا لیکن میرے ان نظریات میں تبدیلی کا تازہ ترین محرک تم دونوں بنے ہو۔ میں یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا ہوں کہ یہ کیسا مذہب ہے جس کے قواعد و ضوابط کی کوئی عقلی دلیل نہیں۔ اسلام میں کوئی بھی قانون، کوئی



کیا گزری ہوگی، تمہیں اس سے سوری کتنا چاہیے۔  
 ”سوری؟۔۔۔ فارواٹ؟“

”ہمارے جذبات سے کھیلنے کے لیے۔۔۔ موقع سے غلط فائدہ اٹھانے کے لیے۔ تم نے ہماری پرابلم جانی اور سوچا۔۔۔ یہ اس وقت دل کے ہاتھوں مجبور ہیں، ان سے کچھ بھی منوایا جاسکتا ہے اور یوں تم نے اتنی چالاکی کے ساتھ ہمیں ٹریپ کرنے کی کوشش کی کہ اگر تمہارا دھرم تمہیں ایک نہیں ہونے دیتا تو تم ہمارے دھرم میں آجاؤ۔“

”میں نے تمہیں ہرگز کوئی لالچ نہیں دیا۔ یہ سچ ہے کہ یہ خیال میرے دل میں کل ہونے والی بحث کے بعد ہی آیا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمہیں اسلام کی جانب راغب کرنے کی میری کوشش کے پیچھے صرف یہی ایک وجہ نہیں۔ میں تمہیں ایک سیدھی اور واضح نصب العین رکھنے والی زندگی کی جانب لانے کا خواہش مند ہوں۔“

”ایسا کبھی نہیں ہو سکتا مختار! وہ ایسا پاپ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایسور کے لیے اس کا جو پریم ہے اس کے آگے میرا پریم تو کچھ بھی نہیں۔“

نندنی نے پورے وثوق کے ساتھ کہا تھا اور تب اے بھیمیت کو اندر تک جاننے کا اس کا دعوادھرے کا دھارا رہ گیا، جب اگلے ہی روز وہ مختار سے کہہ رہا تھا۔

”میں مسلمان ہونے کے لیے تیار ہوں۔“

”مجھے یقین تو نہیں تھا، مگر پوری امید ضرور تھی کہ تم ایک دن یہی کہو گے۔ اتنی جلد کہو گے، یہ اندازہ نہ تھا۔“ مختار نے کچھ حیران۔۔۔ اور زیادہ خوش ہوتے ہوئے اسے گرم جوشی سے گلے لگا لیا۔ نندنی ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھتی رہی۔

”اے بھیمیت تم۔۔۔ وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکی۔ میں کل ہی تمہیں مسجد لے جاؤں گا۔“

”کل نہیں، آج۔۔۔ بلکہ ابھی۔۔۔ اسی وقت۔“ وہ مضطرب سا نظر آ رہا تھا۔ ”ایسا نہ ہو، کل تک میرے قدم ایک بار پھر لڑکھڑا جائیں۔ تم نہیں جانتے میں نے کتنی مشکل سے یہ فیصلہ کیا ہے۔“ اس کی لہو رنگ

بھی بات۔۔۔ بغیر کسی لاجبک کے نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ غیر مسلموں کے بڑے سے بڑے اعتراض کا جواب بھی علماء قرآن و سنت کی روشنی میں بہت واضح اور تسلی بخش انداز میں دے دیتے ہیں۔ اب بیوہ کی شادی یا مرد کی ایک وقت میں ایک سے زیادہ شادیوں کو ہی لے لو۔ غور کیا جائے تو یہ نظام کتنی قباحتوں سے بچاتا ہے، جائز رہتے موجود ہوں تو کوئی چور دروازے نہیں تلاشتا۔ نفس کو مارنا ایک عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حلال راہ بند ہونے پہ وہ حرام راہ پہ چل پڑتا ہے۔“

”تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“ نندنی نے شکن آلود پیشانی کے ساتھ پوچھا۔

”میں تمہیں دائرہ اسلام میں شامل ہونے کی دعوت دے رہا ہوں۔ صرف تمہارے اس مسئلے کے ایک حل کے طور پہ نہیں بلکہ اس لیے کہ جس مذہب کے تم پیروکار ہو، اس نے تمہیں سوائے دیوالیائی قصے کہانیوں کے اور کچھ نہیں دیا۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔۔۔ نہ کوئی ضابطہ حیات۔۔۔ نہ کوئی آفاقی قوانین و قواعد۔۔۔ اسلام دین حیات ہے، وہ تمہارے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ اگر تمہارے ذہن میں کچھ شکوک و شبہات ہیں تو تم جتنا وقت لینا چاہو، لے سکتے ہو، میں اپنے محدود علم سے تمہیں جس حد تک بھی ممکن ہوا، مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا، اور اگر ضرورت پڑی تو اپنے آبا کے پاس لے چلوں گا۔“

”رکو اے بھیمیت!“ نندنی نے اسے یکدم اٹھ کے باہر جاتے دیکھا تو پیچھے سے آواز دی مگر وہ مڑ کے دیکھے بنا وہاں سے نکل گیا۔

”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مختار۔“ نندنی نے اسے ملامت کی۔

”تم جانتے ہو کہ ابھی کا بیک گراؤ بند کیا ہے۔ جس طرح تم اپنے دھارمک ہونے پہ فخر کرتے ہو، اسی طرح وہ بھی ایک شدھ برہمن پر یوار سے ہے، میں اگرچہ ایک لبرل فیملی سے ہوں، اس کے باوجود مجھے تمہاری یہ بات سخت ناگوار محسوس ہوئی، ذرا سوچو، اس کے دل پہ



اس کی شب بیداری کی منظر تھیں۔

”فکر مت کرو۔ تمہارے قدم انشاء اللہ اب کبھی نہیں ڈگ گائیں گے کیونکہ یہ قدم حق کی راہ کی جانب اٹھے ہیں اور اللہ اپنی جانب بڑھنے والوں کی انگلی خود تھام لیا کرتا ہے۔ تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اس کی تسلی کے جواب میں وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ کے رہ گیا۔ نندی نے اس کے تاثرات ناقابل فہم سے لگ رہے تھے حالانکہ اس سے قبل اسے خوش فہمی تھی کہ ان دونوں کے مابین کھنکھن محبت کا ہی رشتہ قائم نہیں ہے بلکہ قابل رشک قسم کی اندر اسٹینڈنگ بھی پائی جاتی ہے۔

”ابھیجیت! مجھے ایک فیصد بھی توقع نہ تھی کہ تم اتنا بولڈ اسٹیپ لے لو گے۔ تم نے ایک بار بھی اپنی فیملی کے بارے میں نہیں سوچا؟“ مختار کے جانے کے بعد نندی نے دوبارہ اسے سنجیدگی سے اس کے فیصلے کی سنگینی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”پہلے ایک بار ان کے بارے میں سوچ کر مجھے کیا حاصل ہوا تھا؟ تم سے جدائی۔ میں اب سوائے اپنے اور کسی کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا۔“ اس کے لہجے سے خود غرضی ٹپک رہی تھی۔

”اس سے تو اچھا تھا کہ یہ ہمت تم تب دکھا لیتے جب تمہارے پتا جی نے گوئی سے تمہاری شادی کرنے کا سوچا تھا۔ شاید مجھ سے شادی کر لینے یہ وہ اتنا نہ بگڑتے جتنا تمہارے مسلمان ہونے پہ ہوں گے۔“

”تب حالات اور تھے۔ وہ سب کچھ بہت اچانک تھا۔ پتا جی نے مجھ سے پوچھے بغیر سب طے کر لیا تھا، بارات تقریباً تیار کھڑی تھی۔ اگر میں انکار کرتا تو شاید وہ جان دے دیتے۔ یا میری جان لے لیتے۔ دوسری وجہ یہ کہ اب میں میچوور ہو چکا ہوں اپنے فیصلے خود کرنے کی ہمت ہے مجھ میں۔ اس وقت ایسا نہ تھا۔“

”یعنی تم صرف مجھ سے شادی کرنے کی خاطر اپنا دھرم بدل رہے ہو؟“ نندی نے تصدیق چاہی اور اس نے بلا توقف اقرار کیا۔

”دھرم اتنی سستی چیز تو نہیں ابھیجیت! تم نے کتنی آسانی سے دھرم کو استعمال کر لیا۔ کیا مختار تمہارے مسلمان ہونے کی اصل وجہ جانتا ہے؟“

”جانتا ہی ہو گا۔ نہ تو وہ دودھ پیتا بچہ ہے نہ ہی اتنا احمق۔“ اس نے لاپرواہی برتی۔

”ہاں یہ بے وقوف نہیں ہے مگر بن رہا ہے۔“ نندی نے تلخی سے کہا۔

”وہ اب تک یہی سمجھ رہا ہے کہ تم اس کی باتوں سے متاثر ہو کے اسلام قبول کر رہے ہو۔ اس کے اللہ کو مان رہے ہو۔“

”سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے۔ میں صرف اپنے اور تمہارے متعلق سوچنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے بس اتنا بتاؤ نندی کہ کیا تم میرے ساتھ ہو؟“

”میں تمہارے ساتھ ہوں ابھیجیت مگر یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں تمہارے ساتھ اتنا بڑا قدم اٹھا پاؤں گی یا نہیں۔ حالانکہ میری فیملی اتنی کنزرویٹو نہیں جتنی تمہاری ہے۔ میں ہمیشہ سے واجبی سی پوجا کرتی رہی ہوں، تمہارے طرح روز صبح ماٹھا ٹیک کے گھر سے نہیں نکلتی۔۔۔ سال میں مشکل سے دو تین بار مندر جاتی ہوں لیکن اس کے باوجود اپنے دھرم سے ہٹنے کو میرا من نہیں مانتا۔“

”مگر ایسی بات ہے تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ ویسے بھی یہ تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔ ہم کورٹ میں جکریں گے اور چونکہ تم غیر شادی شدہ ہونے کے ساتھ ساتھ بالغ بھی ہو۔ اس لیے قانون کے مطابق تم اپنی مرضی سے کسی بھی دھرم کے شخص سے شادی کر سکتی ہو۔ قانون کی نظر میں صرف میرا شادی شدہ ہونا رکاوٹ ڈالے گا تو اس کے لیے میں اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت اور مسلم لاء ایکٹ کا سہارا لوں گا جس کے تحت میں ایک بیوی کے ہوتے دوسری شادی آسانی سے کر سکتا ہوں۔“

”لیکن مسلمان ہونے کے بعد تمہارا نکاح پڑھایا جائے گا اور جہاں تک میں جانتی ہوں۔ نکاح کے لیے عورت اور مردوں دونوں کا مسلم ہونا ضروری ہوتا ہے۔“



کیا مختار تمہارے مسلمان ہونے کے بعد تمہیں نندنی کہتے سے یعنی ایک ہندو سے شادی کرنے دے گا۔  
”میں اس کی اجازت کا محتاج نہیں ہوں۔“ وہ بگڑ کے بولا۔

”اس کا کام بس یہیں تک ہے کیونکہ اس کی مدد کے بغیر میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا۔ قانونی کارروائی ہو جائے دستاویزات اور ثبوت میرے پاس آجائیں اس سے پہلے میں مختار کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے اسے خوش کرنے کے لیے تم بھی اس نکاح کے ڈرامے میں شریک ہو جانا۔“  
”ڈرامہ؟“

”ہاں تو کیا تمہارا خیال ہے میں ساری عمر یہ بوجھ سر پہ لا دے رہوں گا۔ نکاح تو بس دکھاوے کے لیے ہو گا۔ ہم اگلے ہی دن کورٹ میرج بھی کر لیں گے۔ اس کے بعد قانون کی نظر میں ہم میاں بیوی ہوں گے۔ کوئی ہمارے رشتے کو ناجائز نہیں کہہ سکے گا۔ گوتمی اگر میرے ساتھ رہنا چاہے گی تو اس کی مرضی اور اگر طلاق لینا چاہے گی میں خوشی خوشی دے دوں گا۔ مسلمان ہونا صرف ضرورت اور مجبوری کے تحت کاغذوں کی حد تک ہو گا۔“ اس نے اپنے اصل عزائم سے آگاہ کیا۔



مولانا سبحان الیاسی۔ مختار کے والد جو عالم دین تھے بیٹے کے بلانے پہ فوراً ہی بمبئی آن پہنچے۔  
”بجز اک اللہ مختار! تم نے آج الیاسی خاندان کا فرزند ہونے کا حق ادا کر دیا۔ کسی راہ سے بھٹکے ہوئے کو سیدھے رستے پہ لانا بڑے ہی ثواب کا کام ہے۔ کہاں ہے تمہارا دوست؟“

”صرف ایک نہیں اباجی، میرے دو دوست حلقہ اسلام میں آنا چاہتے ہیں۔“ فون پہ اس نے انہیں تفصیل سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

”مگر تم نے تو صرف ابھیجیت کا نام لیا تھا۔ اب ماشاء اللہ دو دوستوں کا بتا رہے ہو۔ یہ تو دو گئے ثواب کی

بات ہے۔ کون ہے وہ دوسرا خوش نصیب۔“  
”وہ ایک لڑکی ہے اباجی۔ نندنی نام ہے اس کا اور اور اباجی ایک بات اور بھی ہے۔“ وہ ہنچا پایا۔  
”قبول اسلام کے بعد ان کا نکاح پڑھانے کی ذمہ داری بھی آپ کی ہے۔“

اس کی توقع کے عین مطابق وہ چونکے۔  
”نکاح۔۔۔؟ یہ نکاح وہ اسلام قبول کرنے کے بعد کرنا چاہتے ہیں یا صرف اس نکاح کے لیے اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں اباجی۔ ہاں وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور آج سے نہیں برسوں سے۔ شادی تو انہیں کچھ عرصہ کے بعد کرنا ہی تھی جب ابھی نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا تو نندنی پہ واضح کر دیا کہ اب وہ کسی مسلمان عورت کو ہی اپنے نکاح میں لے گا۔ اس لیے نندنی بھی رضامند ہو گئی۔“

”لیکن یہ رضامندی سراسر سلام کی خاطر تو نہیں ہے۔ جب تک وہ دل کی سچائی سے اللہ کی وحدانیت پہ ایمان نہیں لاتی اس کا اسلام لانے کا کیا فائدہ؟“

ان کی بات پہ مختار نے شکر ادا کیا کہ وہ مصلحتاً ابھی کی پہلی شادی کے متعلق چھپا گیا تھا۔ ورنہ وہ یہی سمجھتے کہ ابھیجیت صرف اس شادی کے لیے

مسلمان ہو رہا ہے۔ پہلے پہل اس کے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ شاید ابھیجیت اس لیے اسلام قبول کر رہا ہے کہ اس طرح وہ گوتمی سے الگ ہوئے بغیر نندنی کو پا سکتا ہے لیکن پھر اس نے ان خیالات کو جھٹک دیا۔

”کیا فرق پڑتا ہے اگر واقعی ایسا ہو بھی تو۔۔۔ یہ کیا کم ہے کہ وہ اسلام قبول کر رہا ہے۔ انسان بنیادی طور پہ لالچی ہے خود غرض ہے۔ اگر وہ بھی کسی لالچ یا غرض کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے تو فی الحال میرے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ کم از کم مسلمان تو ہو رہا ہے نہ صرف وہ بلکہ اس کی خاطر نندنی بھی۔ ایک بار وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ اسلام کی تعلیمات ان کے دل میں گھر کر لیں گی۔ اللہ بھی میری مدد کرے گا اور ان



کے دلوں میں اسلام کی سچی محبت ڈال دے گا۔“  
اس نے یہ تاویل دے کے خود کو بہلایا تھا تب  
تک وہ ابھجیت کے عزائم سے واقف نہیں تھا۔  
مولانا سبحان الیاسی سے بھی اس نے یہی کہا۔

”مگر نندنی صرف ابھجیت کے لیے اسلام قبول  
کر رہی ہے تب بھی ہمیں اعتراض نہیں کرنا چاہیے  
کہ بہر حال کسی بھی راستے سے سہی۔ وہ حق کی  
جانب تو بڑھ رہی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ایک بار  
حق کی راہ پہ آنے کے بعد اس کا دل خود بخود سچائی کی  
جانب مائل ہونے لگے گا۔“  
”انشاء اللہ تعالیٰ۔“

اگلے دن جامع مسجد میں سبحان الیاسی نے ان دونوں  
کو حلقہ اسلام میں داخل کیا۔  
”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور گواہی دیتا  
ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔“

وہ ان کے بتائے سارے کلمے دہراتا گیا۔ مگر اپنے  
دل سے ان پتھر کی مورتیوں کو نہ ہٹا سکا۔  
اس کی زبان اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرتی رہی۔  
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان  
لانے کا اظہار کرتی رہی مگر اس کے کانوں میں بچپن کی  
سنی لوریوں کی طرح بھجن گونجتے رہے۔

اس کا نام ابھجیت مہادیون نہ رہا، وہ محمد علی  
ہو گیا۔ لیکن مولانا سبحان الیاسی اس کا دل نہ بدل سکے،  
وہ وہی کا وہی رہا۔ وہ ایسا بد نصیب تھا جسے اپنی زندگی اور  
عاقبت سنوارنے کا موقع ملا بھی تو اس نے اس سے  
فائدہ نہ اٹھایا۔ شاید وہ ان میں سے تھا جن پر توبہ اور  
بخشش کے دروازے اللہ نے بند کر رکھے تھے۔ یہی  
وجہ تھی کہ کلمہ پڑھنے کے بعد بھی وہ ”مسلمان“  
ہونے کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔

نندنی کا نیا اور اسلامی نام نورین علی رکھا گیا۔ اس  
کے فوراً بعد دونوں کا نکاح پڑھایا گیا۔ اس موقع پر رتو  
کھنہ اور نندنی کی چند سہیلیاں بھی موجود تھیں جبکہ  
ابھجیت نے اپنے کسی دوست یا واقف کار کو بلائے کی

زحمت کرنا گوارا نہ کیا تھا۔ صرف مختار موجود تھا۔ وہ  
بھی اس لیے کہ وہ اس سارے عمل کا اہم جزو تھا۔  
”تم اس بات کو اتنا خفیہ کیوں رکھنا چاہتے ہو؟“  
اس نے بھی اس رازداری کی وجہ جاننا چاہی۔

”میں چاہوں بھی تو اسے خفیہ نہیں رکھ سکتا۔  
نندنی کو میں اپنے گھر لے جا رہا ہوں، ظاہر ہے ہماری  
شادی سب کے علم میں آئے گی۔ کچھ دنوں تک بات  
ناگ پور تک بھی پہنچ جائے گی۔ اس کے بعد میرا  
مسلمان ہونا بھی سب سے ظاہر کرنا پڑے گا لیکن فی الحال  
میں ایسا نہیں چاہتا۔ مجھے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے  
کے لیے کچھ وقت چاہیے۔“ لیکن اسے یہ نہیں بتایا تھا  
کہ جو بھی ہوتا تھا وہ اتنا جلد ہو جائے گا کہ اسے پہنچنے  
کا موقع تک نہ ملے گا۔

اسی شام بمبئی کے پُرونق علاقے میں ہندو اور  
مسلم طلباء کے دو گروپس کے درمیان فساد ہوا۔ دونوں  
جانب کے دو تین نوجوان مارے گئے اور کئی زخمی  
ہوئے۔ جب بھی حالات سدھرنے لگتے، ایسا ہی کوئی  
نہ کوئی واقعہ ہندو مسلم تنازعے کو نئے سرے سے ہوا  
دے ڈالتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا۔ اگلے کئی روز شہر کے  
مختلف حصوں سے دونوں فریقین کے مابین مڈبھڑکی  
خبریں آتی رہیں۔ کئی بے گناہ مارے گئے، مساجد اور  
مندروں پر حملے کیے گئے۔

یہ ان کی شادی کا چھٹا روز تھا۔ پانچ دن کی چھٹی  
دونوں نے گھر پہ گزاری تھی۔ مرنی، ابھجیت کا قابل  
بھروسہ ملازم تھا۔ اس لیے اسے اس کی جانب سے کسی  
سوال جواب کی امید نہ تھی البتہ اس نے اپنے اسلام  
قبول کر لینے والے ڈرامے کے بارے میں نہ بتایا تھا  
شادی کے بعد وہ پہلا دن تھا جب دونوں اپنے ہاسپٹل  
گئے۔

”مرلی کا کا اگھر کا خیال رکھنا۔ ہنگامے بہت بڑھ گئے  
ہیں۔ بلا ضرورت گھر سے مت نکلتا، یہ نہ ہو کل کے  
اخبار میں تمہاری تصویر چھپی ہو۔“  
”رام رام۔“ وہ اس مذاق پر واقعی خوفزدہ ہو گیا۔



اور ہمیں پتا بھی نہ چلے گا۔ ہم شریف لوگ ضرور ہیں مگر بزدل نہیں۔ نہ ہی کوئی کوئی لاوارث ہے، آئے دو اسے۔“

وہ طیش کے علم میں چلانے لگا۔ اوپر کے پورشن میں رہتے مالک مکان کی بیوی نے سن گن ملتے ہی کلمے پیٹ لیے۔

”رام رام کل جگ آگیا ہے کل جگ۔ اچھے بھلے خاندانی لوگ کیسے کیسے پاپ بغیر کسی خوف کے کرنے لگے ہیں۔ رکھیل کو پتی گمہ کے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ جب ہی تو پہلے دن جب اسے گھر لایا تو نہ ماتھے پہ تلک تھا نہ مانگ میں سندور اور نہ ہی گلے میں منگل سوتر، میں نے ٹوکا تو اگلے دن منگل سوتر پہن لیا، اور وہ ڈاکٹر بنی۔ دیکھنے میں تو بڑی بھولی بھالی اور اچھے پریوار کی لگتی ہے اور لچھن۔۔۔ توبہ توبہ۔۔۔“

ان دونوں کے نکلنے کے کچھ ہی دیر بعد سدھارتھ پنڈت وہاں چلا آیا۔

سدھارتھ پنڈت گوتمی کا بڑا بھائی یعنی ابھیجیت کا سالہ تھا۔ وہ بمبئی کسی کام سے آیا تھا تو بہنوئی سے ملنے کے خیال سے یہاں بھی چلا آیا۔

”ڈاکٹر بابو اور ان کی دھرم پتی ابھی ابھی ہسپتال گئے ہیں۔ آپ کون ہیں شریمان؟“

”دھرم پتی؟“ وہ اپنا تعارف تک کرانا بھول گیا۔

اگر رات ہی فون ہے اس کی بات اپنی بہن گوتمی سے نہ ہوئی ہوتی تو وہ یہی سمجھتا کہ شاید وہ بمبئی آئی ہوئی ہے لیکن اسی کو تو ناگ پور میں فون کر کے اس نے یہاں کا پتالیا تھا۔

”مگر گوتمی دیدی تو ناگ پور میں ہے؟“

”کون گوتمی؟ میں تو ابھیجیت بابو کی دھرم پتی کی بات کر رہا ہوں، ڈاکٹر مندی کی۔“

”کب کی ہے ڈاکٹر صاحب نے شادی؟“ وہ اب قدرے سنبھل کر محتاط انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”یہی کوئی ہفتہ بھر پہلے۔ آپ ہیں کون؟“ اس کا سوال برقرار تھا۔

”تمہارے ڈاکٹر بابو کا سالہ۔“ تصدیق کر لینے کے بعد اب سدھارتھ کو اپنے غیض و غضب کا قابو نہ رہا اور وہ دروازہ کولات مار گئے، مری کو پرے دھکیل کے اندر داخل ہو گیا۔

”کیا جانتے ہو؟ مندی جی کا کوئی بھائی نہیں۔ ان کی صرف ایک ماما جی ہیں اس بھرے سنسار میں اور اگر ہوتا بھی تو تمہارے جیسا بد معاش نہ ہوتا۔ کون ہو تم۔۔۔؟ کوئی چور۔۔۔ یا ڈاکو؟“

سدھارتھ کو وحشت میں سارے گھر میں دندناتے پھرتے دیکھ کر مری نے پوچھا۔ شہر کے حالات بھی ایسے تھے کہ کچھ بھی ممکن تھا۔

”اس ڈاکٹر کا اصل سالہ میری بہن گوتمی کا پتی ہے۔ اس کے دو بچوں کا پتا ہے۔ اس نے کیا سمجھا تھا کہ شہر میں چھپ کے وہ یہاں اپنی رکھیل رکھ سکتا ہے

سنجیو کپور کی کتاب کھانا خزانہ کی کامیابی

کے بعد لذیذ کھانوں کی ترکیبیں

**اندین کھانے**

سنجیو کپور

قیمت : 250 روپے

ڈاک خرچ : 30 روپے

آج ہی گھر بیٹھے منگوانے کے لئے

280 روپے کا منی آرڈر یا ڈرافٹ

ارسال کریں۔

منگوانے کا پتہ

**مکتبہ عمران ڈائن جسٹ**

37 - اردو بازار - کراچی

فون: 2216361



منہوں میں یہ بات آس پڑوس تک پھیل گئی۔  
”پتی کے ہوتے ہوئے دوسری عورت رکھی ہوئی ہے۔“

”کس دھڑلے سے ٹانگ کھیل رہے تھے۔“

ان کے واپس آنے تک مالک مکان ان کا سارا سامان دروازے سے باہر پھینک چکا تھا۔ سدھار تھ نے فون کے ذریعے ناگ پور اور رائے پور میں بھی یہ خبر پہنچادی تھی اور خود دروازے پر ہی ان کا منتظر تھا۔ محلے والوں کی باتیں سن کر ننڈنی کا رنگ زرد پڑ چکا تھا خود ابھیجیت اس صورتحال کے لیے ابھی ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ پہلے مالک مکان اور محلے داروں کے اعتراضات اور الزامات کی صفائی پیش کرے سدھار تھ پنڈت کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے یا پھر اپنے گھر فون کر کے اوم شیو مہادیون کو وضاحت کرے۔ وہ ہر جانب سے گھر چکا تھا۔

”یہ شریفوں کا محلہ ہے، ہم ایسے پاپیوں کو رہنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“ یہ ان کے پڑوسی تھے۔  
”تم نے جھوٹ بول کے گھر کرائے یہ لیا ہے۔ تم نے اپنی رکھیل کو پتی بنایا ہے۔“ یہ مالک مکان تھا۔  
”جو اس مت کرو۔ میں نے ننڈنی سے شادی کی ہے، گورٹ میرج قانون اس رشتے کا گواہ ہے۔ تم کون ہوتے ہو اس رشتے کو گالی دینے والے۔“

”کیسی شادی؟“ سدھار تھ گرجا۔ ”اگر یہ شادی ہے تو ڈوہالی سال پہلے میری بہن کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ابھیجیت مہادیون! کوئی ابھی زندہ ہے، مری نہیں وہ تمہاری بیابھتا پتی ہے اور تمہارے دو بیٹوں کے ساتھ تمہارے ہی ماتا پتا کی چھایا میں تمہارے اپنے گھر میں رہتی ہے۔ اس کے بعد اس عورت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے تمہاری زندگی میں اسے گالی نہیں دیں گے تو اور کیا کریں گے۔ یہ شادی واوی کا ٹانگ میرے سامنے مت کھیلنا۔ چار کتابیں ہم نے بھی پڑھ رکھی ہیں۔ گوتمی کے ہوتے تم دوسری شادی کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی زندگی میں تم کسی بھی دوسری عورت سے

جو سمبندھ رکھو گے۔ وہ ناجائز ہوگا، سراسر ناجائز۔“  
صورتحال سے گھبرا کے نزدیکی پی سی او سے ابھیجیت نے مختار کو فون کیا۔ وہ دس بارہ منٹ کے اندر اندر وہاں موجود تھا۔

”یہ ابھیجیت مہادیون نہیں، محمد علی ہے اور یہ ان کی اہلیہ بیگم نورین علی ہیں۔ پچھلے ہی ہفتے انہوں نے اسلام قبول کیا اور میرے والد مولانا سبحان الیاسی نے ان کا نکاح پڑھایا۔“

اس کے اس نئے تعارف پہ سارے مجمع کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ سدھار تھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ”جیاجی“ کو دیکھنے لگا جو اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ یہ صورتحال تو اس کے اندازے سے بھی زیادہ سنگین ثابت ہو رہی تھی۔ حیرت اور بے یقینی کا اس قدر شدید حملہ تو اس پہ تب بھی نہ ہوا تھا جب اسے اپنے بہنوئی کے کسی دوسری عورت کے ساتھ رہنے کی خبر ملی تھی۔

”اور مسٹر سدھار تھ پنڈت! یہ میرے دوست محمد علی کی جائز، حقیقی اور قانونی بیوی ہیں، آپ ان کی حیثیت کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ رہا آپ کی ہمیشہ کا سوال تو وہ اب ایک مسلمان شوہر کے ساتھ اپنا تعلق برقرار رکھنا چاہیں تو یہ ان کی مرضی پہ منحصر ہے۔ محمد علی کو قطعاً کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ تبدیلی مذہب کے بعد اس شادی کی اب کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔“

”سیسے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جیاجی! کہہ دیں یہ مسلا جھوٹ بک رہا ہے۔“

لیکن ابھیجیت سر جھکا کے رہ گیا۔ اس کا یہ انداز سدھار تھ کو باور کرا گیا کہ مختار جھوٹ نہیں کہہ رہا لیکن مختار کو اپنے دوست کا یہ شرمسار سا اقرار پسند نہ آیا۔ بعد میں وہ اس پہ برس پڑا۔

”محمد علی! تم اب مسلمان ہو اور کسی ایمان والے کو یہ کمزوری زیب نہیں دیتی۔ اگر تم نے اپنے دل کی تمام تر رضامندی کے ساتھ اسلام قبول کیا ہے تو فخر یہ اس کا اعلان کرو، سر جھکا کے نہیں سر اٹھا کے کہو کہ تم اب



مسلمان ہو۔ جبکہ تم اس کے برعکس یوں شرمندہ شرمندہ سے نظر آرہے تھے جیسے خدا نخواستہ تمہیں اپنے اس عمل کا افسوس ہو رہا ہو۔“

”نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ گڑبڑایا۔

سدھارتھ ایک شدت پسند ہندو مذہبی تنظیم کا اہم کارکن تھا۔ یہ بات ابھی سمجھ جانتا تھا لیکن اسے لگتا تھا کہ وہ سابقہ رشتے داری کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے غیض و غضب کو اپنے تک محدود رکھے گا۔ لیکن اس کی یہ خام خیالی دھری گی دھری رہ گئی، جب رات گئے وہ مسلح گروہ کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ انتہا پسند ہندوؤں کے لیے یہ تھک آمیز اور ناقابل قبول امر تھا کہ ایک برہمن ٹھاکر مشرف بہ اسلام ہو گیا ہے۔ ابھی سمجھ کے گھر کے مقل دروازے پہ پھراؤ کیا گیا، ہوائی فائرنگ کی گئی، ڈنڈوں سے کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے گئے۔ وہ اور نندنی گھر کے سب سے پچھلے کمرے میں اندھیرا کیے بیٹھے خوف اور وحشت سے کانٹے رہے۔ سدھارتھ کے ساتھیوں نے بجلی، فون اور گیس کے کنکشن تک منقطع کر دیے تھے۔ دو تین گھنٹوں تک ہل بازی مچانے کے بعد وہ لوٹے تو محلہ بھرا ابھی سمجھ کے گرد جمع ہو گیا۔

”تم ابھی اسی وقت یہ گھر اور علاقہ چھوڑ دو۔“ ان کا مطالبہ تھا۔

”مجھے اس ماہ کا کرایہ بھی نہیں چاہیے حتیٰ کہ تمہاری وجہ سے میرے مکان کا جو نقصان ہوا ہے میں وہ بھی چھوڑتا ہوں لیکن تم یہ مکان خالی کرو۔“ مکان مالک بھی سخت خوفزدہ تھا۔ شہر کے حالات ہی اس قدر خراب تھے کہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ صرف یہ علاقہ ایسا تھا جہاں اب تک امن و امان برقرار تھا شاید اس لیے کہ یہ ہندو اکثریت والا علاقہ تھا جہاں اکا دکا مسلمان رہتا تھا۔ ان کا وجود پھر بھی قابل برداشت تھا لیکن کسی ہندو کا مسلمان ہونا اور وہ بھی ان حالات میں جب ملک بھر میں ہندو مسلم فسادات زوروں پہ تھے، ان سے برداشت نہ ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ مختار کے گھر بھی پہنچ گئے۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے ایک اونچی ذات

والے عزت دار ہندو کو درغلا کے اپنے مذہب میں شامل کیا تھا۔

یہ صورت حال دونوں کے لیے تکلیف دہ تھی۔ مختار نے مشورہ دیا۔

”کچھ عرصے کے لیے ہم چھٹی لے کے کسی محفوظ مقام پہ چلے جاتے ہیں۔“

”گھر سے زیادہ محفوظ مقام اور کیا ہو سکتا ہے لیکن میرے لیے تو یہ بھی ممکن نہیں میں تو نندنی کو لے کے تمہاری طرف آ رہا تھا اور تم خود یہاں سے۔“

”نندنی نہیں نورین۔“ اس نے تصحیح کی۔

”ہاں وہی۔۔۔“ ابھی سمجھ لٹو کے جانے لگا۔

جھنجھلایا۔ ”اب بتاؤ میں کہاں جاؤں؟ تم تو اپنے ابا کے گھر کے بجائے الہ آباد اپنے ماموں کے ہاں یا حیدر آباد اپنی پھوپھی کے گھر بھی جاسکتے ہو جو فسادات سے بالکل محفوظ علاقے ہیں اور جہاں مسلمانوں کو بالکل کوئی خطرہ نہیں لیکن میں تو ناگ پور بھی نہیں جاسکتا۔ ماما جی سے میری بات ہوئی تھی۔ ان سے پتا چلا کہ گوتمی کے پتا اسے اور بچوں کو رائے پور لے جاتے ہیں۔ برادری کی پناہ میں پتا جی بہ خوب لعن طعن کی گئی اور میرے پتا جی جن کی اپنے علاقے میں اتنی عزت ہے، ان پر مندر کے پنڈت نے اندر داخل ہونے پر پابندی لگا دی کہ وہ ایک مسلمان بیٹے کو جنم دینے کا پاپ گریہ کر رہے ہیں۔ پتا جی نے صاف اعلان کر دیا کہ اب ان کی زندگی، دل اور گھر میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں اگر کبھی زندگی میں میرا اور ان کا سامنا ہوا تو وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیں گے۔ انہوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مجھے ان کی چتا کو آگنی دینے کی اجازت نہیں۔“

”ہوں۔۔۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا پھر فیصلہ کن لہجے میں کہنے لگا۔

”یوں تو میں اپنے گھر جا رہا تھا لیکن اگر تمہیں اور نورین کو پناہ چاہیے تو میں تمہیں اپنا ابا جی کے گھر کے بجائے حیدر آباد میں اپنی پھوپھی کے گھر لے چلا ہوں، وہ تمہیں مہمان بنانا اپنی سعادت سمجھیں گے۔ ایک تو حیدر آباد ویسے بھی محفوظ علاقہ ہے۔ دوسرے یہ کہ







تھی کہ جلد از جلد یہاں سے نندنی کو لے کے چلا جائے۔ جہاں نہ مختار ہو نہ اس کا مولانا باپ نہ سید پھوہا اور نہ اس کے مولوی بیٹے وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی جیسے۔ حالات بھی پہلے کی نسبت سنبھل چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ دوبارہ بمبئی جانے کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ سدھارتھ بری طرح اس کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے اس کی جوان بہن بپا ہوتا ہونے کے باوجود ایک بیوہ کی زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے کسی ایسی جگہ سیٹھل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا جہاں اس کا کوئی واقف کار نہ ہو، اس کے لیے اسے ایک بار پھر سید عبداللہ شاہ سے مدد طلب کرنا پڑی۔

”تو حیدر آباد میں کیا برائی ہے؟ یہاں تمہیں کس سے خطرہ ہے؟“

”سب سے بڑا خطرہ تو تم خود ہو۔“ اس کے سوال کا جواب وہ دل ہی دل میں دے کے رہ گیا۔

”میرا دل نہیں لگ رہا یہاں۔“ اس سے زیادہ بودا بہانہ اسے نہ ملا تھا۔ شاہ صاحب بردباری سے مسکرا دیے۔

”دل لگانا پڑتا ہے میاں! دنیا داری میں نہ لگے تو غنیمت جانو اور اللہ سے لو لگا لو۔ وہ دل کو سکون بخشنے والا ہے۔“

”جی آپ درست کہتے ہیں مگر دنیا میں رہنا ہے تو دنیا کے طریقوں کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ میں کب تک آپ پر بوجھ بنا رہوں گا۔ میں نندنی کے ساتھ اپنا زالی گھر سنانا چاہتا ہوں۔“

”بہت افسوس ہوا بیٹیا یہ جان کے کہ تم اس گھر کو اپنا ذاتی گھر نہیں سمجھتے اور واللہ! تم ہم پر بوجھ نہیں ہو۔ میرا ایمان ہے کہ میرے اعمال میں کسی نیکی کا اضافہ کرنے کے لیے اللہ نے تمہیں میرے گھر ٹھہرایا۔“

”ہاں تم نیکیاں کماؤ اور میرے پاپ بڑھاتے جاؤ۔ مجھے تو زکھ میں بھی جگہ نہ ملے گی اگر کچھ اور دن تمہارے گھر ٹھہر گیا۔“ وہ اندر ہی اندر تپ و تپ کھا رہا تھا۔

”مگر میری خودداری مجھے اس کی اجازت نہیں دے رہی۔ آپ کی محبت اور مہربانی اپنی جگہ، میں آپ کے جذبات کا احترام کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں نورین کو یہاں سے لے جانا چاہتا ہوں۔“ وہ بضد تھا۔

”میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ بہتر تو یہی ہے کہ تم یہیں حیدر آباد میں میری نظروں کے آس پاس اپنی بیوی کے ساتھ رہو۔ تمہاری رہائش اور ملازمت کا بندوبست دنوں میں نہیں گھنٹوں میں ہو جائے گا لیکن اگر کسی اور شہر میں سیٹھل ہونا چاہتے ہو تو میں یہ بھی کروں گا، ہاں اس میں کچھ وقت لگے گا۔“

ایک بار پھر وہ صبر کے ساتھ ان تکلیف دہ شب و روز کو جھیلنے پر مجبور تھا، اب اس میں انتظار کی اذیت بھی شامل تھی۔ ایسے میں اس نے ایک ایسی خبر سنی جو پچھلے کئی ماہ میں پہلی خوش کن خبر تھی۔

نندنی ماں بننے والی تھی۔  
آنے والا بچہ یقیناً اتنا خوش بخت تھا کہ اس کے آنے کی صرف خبر ہی ابھیجیت کے لیے لکھی ثابت ہوئی۔

”پونا کے سرکاری ہسپتال میں تمہارے لیے جگہ نکال دی ہے۔ وہاں کے فکس سے خود جا کے ملنا پڑا، البتہ فی الحال کسی لیڈی ڈاکٹر کی سیٹ ملنا مشکل ہے۔ یوں بھی بیٹیا کو ابھی آرام کی ضرورت ہے۔ اسے یہیں رہنے دو۔ چونکہ تمہاری ملازمت ہنگامی بنیادوں پر حاصل کی ہے، اس لیے سرکاری رہائش گاہ ملنے میں بھی کچھ وقت لگے گا تب تک تمہیں ہاسٹل میں رہنا پڑے گا۔ ایسے میں بیوی کو اس حالت میں کہاں لیے پھرو گے اسے کسی مجرہ کار عورت کی نگرانی کی سخت ضرورت ہے۔“

طوعاً کرہاً اسے نندنی کو ان کے حوالے کرنا پڑا۔ وہ بلک بلک کر رو دی۔

”ابھی! مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ یہ سب کچھ بہت الگ ہے بہت زیادہ الگ، مجھے لگتا ہے میں کسی اور سنسار میں آگئی ہوں۔ یہ مجھے پتا نہیں کیا بنانا چاہتے ہیں۔“



”میں بھی تمہیں ان مولویوں کے نرغے میں نہیں چھوڑنا چاہتا، لیکن جو بھی ہے نندنی! تم یہاں محفوظ تو ہو۔ وہ نیا شہر ہے اور اجنبی بھی پتا نہیں وہاں میرے ساتھ کیسے حالات پیش آئیں۔ اور تمہاری حالت بھی تو ٹھیک نہیں۔ یہ ہمارا بچہ ہے اور ہمارے پیار کی نشانی بھی۔ میں اسے خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ وہاں جاتے ہی میں کرائے کا گھر ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا، سرکاری مکان ملنے کے انتظار میں سے برباد نہیں کروں گا اور رہا تمہارا دوسرا مسئلہ تو ایسا کرو، اپنی طبیعت خراب ہونے کا بہانا کر کے کمرہ بند کر کے بیٹھی رہا کرو۔“

اسے بہت سی تسلیاں دے کے اور وعدے کر کے وہ پونا کے لیے روانہ ہو گیا۔

سرکاری ہسپتال کی نوکری میں ایک خالی خولی ایم بی بی ایس کی ڈگری والے ڈاکٹر کی کیا تنخواہ ہو سکتی تھی۔ اس کی اسپیشلائزیشن کی تیاری دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ بمبئی میں تو اسے ناگ پور سے اوم شیو مہادیون کی جانب سے ہر مہینے بھاری رقم موصول ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سکون سے اپنی پڑھائی میں مصروف تھا لیکن پونا آ کے اسے آلے وال کا بھاؤ معلوم ہوا۔ نئے گھر میں نئی زندگی گزارنے کے لیے اسے معقول رقم کی ضرورت تھی، بہت سا ضروری سامان خریدنے کے لیے اور نندنی کو بھی وہ اس ہنگامی شادی پہ کچھ نہ لے کے دے سکا تھا۔ اس کی دوسری سہیلی مگر نندنی کی تو پہلی شادی تھی۔ اس کے بھی زیور گہنوں کے کچھ ارمان ہوں گے۔ یہ سوچ کے ابھیجیت نے فی الحال کرائے پہ مکان لے کے اپنی تنخواہ ضائع کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ گورنمنٹ کی جانب سے ملنے والا کوارٹر پانچ ماہ بعد خالی ہونے والا تھا۔ تب تک سوائے انتظار کے دوسرا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے نندنی کو بھی صبر کے ساتھ مزید پانچ مہینے وہاں گزار لینے کی التجا کی لیکن وہ وہاں کن حالات میں رہ رہی تھی اس کا اندازہ اسے تب ہوا، جب وہ دو مہینے بعد چند دنوں کی چھٹی لے کے حیدر آباد پہنچا۔

نندنی بے حد کمزور اور زرد رہی تھی۔ اس کی وجہ شاید اس کی ذہنی حالت ہو۔ ورنہ اس کی جسمانی صحت اور خوراک کا خیال رکھنے والے تو بہت سے لوگ اس گھر میں موجود تھے۔ اس صبح بھی وہ جاگاتو صحن میں رکھے تخت پہ پھوپھی جی بیٹھی بلند آواز میں سورہ مریم اور سورہ یوسف کی تلاوت کر رہی تھیں اور ان کے برابر مجبور سے انداز میں بیٹھی نندنی جمائیاں روکنے کی بھرپور اور مسلسل کوششیں کر رہی تھی۔

”نندنی۔ نورین۔“ عادتاً اس کا نام پکارتے پکارتے اسے نورین کہہ کے آواز دی۔ وہ اجازت طلب نگاہوں سے پھوپھی جی کو دیکھنے لگی جنہوں نے تلاوت کے دوران ہی آنکھ کے اشارے سے اسے اٹھنے کی اجازت دی۔ وہ گویا شکر ادا کرتی وہاں سے بھاگی۔

”تم وہاں کیا کر رہی تھیں؟“ ابھیجیت نے ناگواری سے پوچھا۔

”دیکھ نہیں رہے تھے، وہ مجھے اپنے قرآن کا پلٹ سنا رہی تھیں۔“ اس نے اسی ناگواری سے جواب دیا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا نندنی جو اس حالت میں یہ سب سن رہی تھیں۔ تم سے میں نے کہا تھا کہ اپنے کمرے میں اکیلے وقت گزارا کرو۔ یہ ان سے بچنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے اور تم اس حالت میں تمہیں گیتا اور رامائن پڑھنی چاہیے، کیا تم نہیں جانتیں، اس سے ہونے والے بچے پہ کتنا اچھا اثر پڑتا ہے۔“

”کچھ ایسے ہی خیالات ان پھوپھی جی کے بھی ہیں۔ اس لیے وہ مجھے یہ سب سناتی رہتی ہیں تاکہ میرے ہونے والے بچے پہ ان باتوں کا اچھا اثر ہو اور وہ ایک اچھا اور سچا مسلمان بن کے پیدا ہو۔“ وہ جل کے کہہ رہی تھی۔ ابھیجیت اندر تک کانپ کے رہ گیا۔ نندنی کی ڈیووری میں دو ماہ تھے۔ اس حالت میں اس کا سفر کرنا مشکل تھا۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر لوٹ آیا۔ ایک ماہ بعد اسے اپنے باپ کے مرنے کی خبر ملی۔



اس نے ماں کو فون کر کے آنے کی اجازت طلب کی مگر  
ویدا دیوی نے صاف انکار کر دیا۔

”تمہاری پتا مرتے سے مجھے قسم دے گئے ہیں، مجھے  
ان کی آخری اچھا پوری کرنی ہی پڑے گی، چاہے اس  
کے لیے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہی کیوں نہ ہو جائے۔  
میں تمہیں ان کے کریا کرم (آخری رسومات) میں بھی  
شامل ہونے کی آگیاہ نہیں دے سکتی۔“ ماں کے دو  
ٹوک جواب یہ وہ بکھر گیا۔

”نندنی! پتا جی کا دیہانت ہو گیا۔“ اس نے فون پہ  
اپنا غم ہلکا کرنا چاہا۔

”اور میں وہ بد نصیب ہوں جو ان کی ار تھی کو کندھا  
بھی نہیں دے سکا اور یہ سب میرے اس جلد بازی  
میں کیے فیصلے کے کارن ہوا ہے۔ اب بس یہی انتظار  
ہے کہ کب تم فارغ ہو، کب میں تمہیں لے کے اپنے  
اس نئے گھر میں آؤں۔ اگلے مہینے فلیٹ کی چابی مل  
جائے گی۔“

”اور اگلے ہی مہینے میری ڈیوری ہے، تم آؤ گے  
ناں؟ ورنہ میں خود کو بہت اکیلا محسوس کروں گی۔“  
اس نے وقت سے پہلے چھٹی لینے کی بہت کوشش  
کی مگر بے سود، عین بچے کی پیدائش کے روز وہ  
حیدر آباد پہنچا۔ گھر کے دروازے پہ ہی شاہ صاحب کے  
پوتوں، پوتیوں نے خوشی سے اچھلتے ہوئے اسے خبر دی  
کہ وہ ایک بیٹی کا باپ بن گیا ہے۔

وہ بے تابی سے اندر بڑھا اور جیسے اس کے قدم پتھر  
کے ہو کے رہ گئے۔ اس کی نومولود بچی سید عبد اللہ شاہ  
کی گود میں تھی اور وہ اس کے کانوں میں اذان دے  
رہے تھے۔

”مبارک ہو بیٹا! اللہ نے تمہارے گھرانے رحمت  
بھیجی ہے۔ نبی کا سلام آیا ہے۔“ پھوپھی بھی اس سے  
کہہ رہی تھیں مگر اسے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ  
دکھائی دے رہا تھا۔

اس کی سماعتوں اور بصارتوں پہ فقط ایک ہی منظر  
تھا۔

شاہ صاحب کی گود میں سمائی اس کی بچی۔

اور اس کے کانوں میں لوری کی طرح گونجتی اذان۔  
اس رات وہ بند کمرے میں تڑپ تڑپ کے اتار دیا  
جتنا اپنے باپ کے مرنے پہ بھی نہ رویا تھا۔



اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔

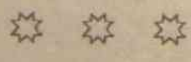
پریتی دیون کے کانوں میں مختار الیاسی کی آواز مدھم  
ہوتی چلی گئی اور اذان کے وہ الفاظ گونجتے چلے گئے جو  
اسے خوابوں میں اپنی جانب کھینچتے تھے۔

”ہاں۔ اب میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ آپ سچ کہہ  
رہے ہیں۔“ اس نے نہایت مدھم آواز میں سرگوشی  
کی تھی۔

ارباز الیاسی بھی دم سادھے اپنے پچاسے یہ ساری  
رو سید اوسن رہا تھا۔

”کیا آپ نے اپنے دوست کے حیدر آباد جانے اور  
پھر پونا میں ملازمت کرنے کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہ  
نہیں کیا تھا۔“ یہ ارباز کا ہی سوال تھا۔

”کیا تھا۔ لیکن وہ خود مجھ سے کئی کتر ا رہا تھا۔ میں  
نے اس کے گریز کو اس کی ذہنی پریشانی اور الجھن پہ  
محمول کیا۔ دوسری طرف میری شادی ان ہی دنوں میں  
ہو جانے کی وجہ سے میں بھی نئی مصروفیات میں مگن  
تھا۔ البتہ مجھے اس کے حالات کا علم ہوتا رہتا تھا۔ آخر  
وہ میرے ہی عزیزوں کے ہاں رہ رہا تھا۔ پہلے نورین  
۔۔۔ یعنی نندنی کھنہ کے امید سے ہونے کی خبر۔ پھر  
اس کا پونا جانا۔ بیٹی کی پیدائش اور اس کے فوراً بعد  
نندنی کا یرقان میں مبتلا ہونا۔“



اس واقعے کے بعد اب ابھیجیت کو مزید وہاں رکنا  
محال لگنے لگا۔ فوراً دونوں کو یہاں سے لے جانے کا  
فیصلہ اس نے وہیں کھڑے کھڑے کر لیا تھا لیکن  
قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ نندنی یرقان میں مبتلا  
ہو گئی۔ ایسی حالت میں اس کے لیے سفر کرنا خطرناک  
ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ خود اکثر تھا، اس بات سے بخوبی  
آگاہ تھا کہ اگر وہ نندنی کو یہاں سے لے بھی جاتا ہے۔



تھا۔ ”ایک اور دل جلا دیئے والی اطلاع سنائی دی۔  
”شباباش جیتی رہو۔“

اس نے مجبوری کے عالم میں یہ سب ایک کڑے  
گھونٹ کی طرح برداشت تو کر لیا مگر س بار وہ یونالوٹا تو  
نئے عزائم کے ساتھ۔ اپنی بیٹی کو فاطمہ بنتے دیکھتا اس  
کے لیے انتہا درجے کا تکلیف دہ امر تھا۔



”چچا جان! یہ پریتی۔۔۔ میرا مطلب ہے فاطمہ۔۔۔“  
ارباز نے کچھ جھنجھکتے ہوئے پوچھنا چاہا۔  
”یہ کب۔۔۔ دراصل۔۔۔“

”میں سمجھ گیا ہوں۔ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“ وہ  
مسکرائے اور پھر دم بخود بیٹھی پریتی کی جانب دیکھا۔ اتنا  
سب کچھ جان لینے کے بعد بھی اس کی خاموش  
آنکھوں میں ان گنت سوال مچل رہے تھے۔

”اتنا تو تمہیں پتا چل گیا ہو گا کہ یہ سید عبداللہ شاہ  
میرے پھوپھا، یعنی تمہارے دادا کے متعلق ہے اور یہ  
بھی کہ پریتی کو دودھ پلانے والی میری پھوپھی جی کی بڑی  
ہو زیدہ ہی تمہاری مرحوم والدہ تھیں۔ اب یہ بھی  
جان لو کہ پریتی سے چودہ ماہ قبل ان کا جو بیٹا ہوا تھا اور  
جسے انہوں نے اس کے ساتھ ہی اپنا دودھ پلایا تھا وہ  
کوئی اور نہیں، تم تھے ارباز الیاسی! اس لحاظ سے تم  
پریتی دیون۔۔۔ نہیں فاطمہ علی کے دودھ شریک بھائی  
ہو۔“

”میں۔۔۔؟“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔ سر  
جھکائے گم صم بیٹھی، زرد رنگت اور وحشت بھری  
آنکھوں والی اس لڑکی کے لیے دل میں یکایک ہی ڈھیر  
سارا پیار اٹھ آیا۔

اس نے آگے بڑھ کے اپنا کپکا تباہ اس کے سر  
پر رکھا۔ لیکن پریتی اس وقت ہر چیز سے بے نیاز تھی۔  
”آپ نے یہ تو بتادیا انگل کہ ابھیجیت مہادیون  
اور نندنی کھنڈے نے محمد علی اور نورین بننے کا سفر کیسے اور  
کیوں طے کیا۔“ بہت وقت کے بعد وہ یہ کہنے کے  
قابل ہوئی۔ ”لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ محمد علی

خود علاج کرتا ہے تب بھی بچی کو سنبھالنے کے قابل  
ہونے میں اسے ہفتے بھی لگ سکتے ہیں اور مہینے بھی،  
برقان کے مریض کو یوں بھی دوسروں سے الگ تھلگ  
رکھا جاتا ہے اور نوزائیدہ بچے کے لیے تو بہت زیادہ  
پرہیز کی ضرورت ہے، اچانک اسے کچھ خیال آیا۔  
”میں بچی کے لیے دودھ کے ڈبے لے آتا ہوں۔  
ماں کا دودھ بچی کے لیے خطرناک ہے کیونکہ نورین  
شدید قسم کے برقان کی مریضہ ہے۔“

”ڈاکٹر! ہمیں پہلے ہی متنبہ کر چکی ہے اور میری بہو تو  
ماشاء اللہ سے خود قابل ڈاکٹرنی ہے، اسے بھی سب پتا  
ہے۔ اس لیے ہم نے بچی کو ماں کا دودھ پلایا مگر اس کی  
ماں کا نہیں بلکہ میری بڑی بہو زیدہ نے اپنا دودھ پلایا  
ہے۔ اب وہ فاطمہ کی رضاعی ماں ہے۔“

”فاطمہ۔۔۔ رضاعی ماں؟“ یہ سب اس کے لیے  
ناقابل فہم تھا۔

”ہاں، میں نے اس نیک بخت بچی کا نام فاطمہ رکھا  
ہے۔“ شاہ صاحب مسکرائے۔

”اور اب اس کا رشتہ ہمارے خاندان کے ساتھ اور  
بھی گہرا ہو گیا ہے کیونکہ اس کے اندر بھی اس صلاح،  
نیک اور پرہیزگار عابدہ خاتون کا دودھ ہے، جس پہ میری  
نسل پروان چڑھ رہی ہے۔“

اب وہ بالکل ہی ڈھے گیا۔ اس نے بازار سے  
مختلف دودھ کے ڈبے لالا کے اور وزنی دلائل دے  
دے کے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر خود بچی  
نے ہی بازار کا دودھ بننے سے انکار کر دیا۔ زبردستی  
پلانے پہ وہ سخت بیمار ہو گئی۔

”زیدہ بیٹی! دودھ پلاتے ہوئے درود شریف کا ورد  
کیا کرو، طبیعت میں سیری ہوتی ہے بچے کی۔“ پھوپھی  
جی کی نصیحت اس کے کان سے ٹکرائی۔

”جی امی جان! ایسا ہی کر رہی ہوں، یہ ہدایت تو آپ  
نے میرے تینوں بچوں کی دفعہ کی تھی اور میں نے پہلے  
سے بے باندھ رکھی ہے۔“ زیدہ بھابھی کی شگفتہ آواز  
بھی سنائی دی۔

”اور ہاں، دودھ پلانے سے پہلے وضو بھی کر لیا



اور نورین سے ابھی اور نہیں کیسے بنے؟

”یہی تو ساری بات ہے کہ وہ اس بنے بگڑنے کے عمل میں کچھ بھی نہ بن سکے۔“ مختار الیاسی کے لہجے میں تاسف نمایاں تھا۔

”ہمیں یہ غلط فہمی تھی کہ ہم نے انہیں سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، حق کا راستہ۔۔۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے ”شارٹ کٹ“ سمجھ کے اختیار کیا تھا۔

اب یہ ان کی قسمت کہ یہ راستہ ان کی توقع سے بڑھ کے طویل ہو رہا تھا۔ شاید اللہ انہیں زیادہ سے زیادہ مواقع دینا چاہ رہا تھا اپنی زندگی سنوارنے کے۔۔۔ مگر وہ اللہ کی دی اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ان کے نصیب میں ہی ہدایت نہ لکھی تھی سو حق سے محرومی ان کا مقدر ٹھہری۔ پونا جا کر ابھی حیات نے نجانے کیا کیا جتن کر کے اپنا اور نندنی کا نیا پاسپورٹ بنوایا۔ اس کی ساری جمع پونجی اسی میں لگ گئی۔ اب اگر وہ کسی اور ملک کا ویزا لگوا بھی لیتا، تو جانے کے لیے ٹکٹ خریدنے تک کے بھی پیسے اس کے پاس نہ تھے۔ سو اس احسان فراموش کے شاطر دماغ نے ایک اور گمراہ کن راستہ اسے سمجھایا۔ اس نے امریکن ایمپرسی

میں جا کے پناہ کی درخواست دے دی۔ بقول اس کے، میں نے یعنی اس کے ایک مسلمان دوست مختار الیاسی نے اسے ورغلا کے جبرا ”مسلمان ہونے“ پہ مجبور کیا۔ اور اب اس کی بیوی کو مجبوس رکھا ہوا ہے۔ اس کی بیوی اور بچی کو اپنے پاس جبرا ”روک کے سید عبد اللہ شاہ اسے بلیک میل کر رہے ہیں کہ وہ خود کو مسلمان ظاہر کرے جبکہ وہ اپنے دین پہ قائم رہنا چاہتا ہے۔

لیکن اگر وہ اس میں کامیاب ہو بھی جاتا ہے تب بھی اسے اور اس کی فیملی کی جان کو انتہا پسندوں سے خطرہ ہے۔ ہندو انہیں مسلمان جان کر جبکہ مسلمان ہندو سمجھ کے جان سے مارنے کی کوشش کر سکتے ہیں لہذا اسے اس کی فیملی سمیت امریکہ میں پناہ دی جائے۔ چند کارروائیوں کے بعد اس کی یہ اپیل منظور ہو گئی۔ مگر اس سارے عمل میں مجھے اور میرے خاندان کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔ مجھے ایک شریف شہری

کو ہراساں کرنے اور میرے عالم دین پر ہیزگار اباجی کو ایک ہندو کو جبرا ”مسلمان کرنے کے جرم میں زیر حراست لیا گیا۔ اگرچہ یہ بے جان مقدمہ جلد ہی خارج ہو گیا مگر عزت یہ لگے داغ اتنی جلدی نہیں دھلتے۔ اباجی اس رسوائی کو برداشت نہ کر سکے اور ہارٹ اٹیک میں گزر گئے۔

پھوپھاجی کا سارا سیاسی کیریئر داؤ پہ لگ گیا۔ پولیس نے چھاپہ مار کے ان کے گھر سے اس عورت اور بچی کو برآمد کیا تھا جسے تحفظ اور آرام دینے کی خاطر ان کا پورا گھر انہیں پیش پیش تھا۔ وہ مردود خود تو دفعان ہو گیا۔ مگر ہمارے خاندان کو ایسی چوٹ لگا گیا جو آج تک کک دیتی ہے۔ بدنامی اور رسوائی تو جو ہوئی سو ہوئی، یہ ملال اب تک نہیں جاتا کہ جسے نو مسلم جان کے ثواب کی نیت سے اپنے گھر رکھا، وہ نہ تو نو مسلم تھا نہ ہی غیر مسلم بلکہ وہ تو مرتد تھا اور مرتد شرعاً ”واجب القتل“ ہوتا ہے۔ اسے جسے ہمیں قتل کر کے ثواب کمانا چاہیے تھا اسے سر آنکھوں پہ بٹھا کے ہم گناہ سمیٹتے رہے۔ وہ ہمیں ڈھال بنا کے مذہب کو استعمال کرتا رہا۔ ان سب کا زمہ دار میں ہوں، صرف میں۔۔۔ وہ میرا مجرم ہے۔“



”کون ہوں میں؟“

”فاطمہ علی۔۔۔؟“

”یا پریتی دیون۔۔۔؟“

اگر انسان کی بنیاد وہ شناخت ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ پیدا ہوتا ہے۔۔۔ یا جو پیدائش کے بعد اس کا حوالہ بنتی ہے تو پھر میں فاطمہ علی ہوں اور اگر شناخت وہ ہوتی ہے جو والدین آپ کو عطا کرتے ہیں تو میں پریتی دیون ہوں۔ لیکن اگر والدین کی اپنی شناخت ہی مشکوک ہو تو وہ اولاد کو کیا دیں گے؟“

وہ اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی ایسے سوال۔ جس کے جواب اس کے پاس نہ تھے۔

کافی کا بھاپ اڑا تاں کم اس کے سامنے آیا تو اس نے دونوں ہتھیلیوں کی پشت سے اپنی دھندلائی ہوئی



آنکھیں میلیں۔ بھاپ کے اس بار بار باز کا چہرہ تھا اس کی کچھ۔۔۔ بلکہ بہت کچھ کہتی آنکھیں تھیں۔ پریتی نے ان بولتی آنکھوں سے نظریں چرائیں۔  
”کیا سوچ رہی ہو؟“ جواب میں اس نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے اب چلنا چاہیے۔“  
”میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“  
”میں اکیلی ہی آئی تھی۔“

”تب تک میں یہ نہ جانتا تھا کہ تم میری ذمہ داری ہو۔ اب میں اپنی بہن کو اس خراب موسم اور گہری ہوتی رات میں اکیلے کیسے جانے دے سکتا ہوں۔“  
اس کے بے حد جذباتی لہجے پر پریتی چپ کی چپ رہ گئی۔

”کہاں چلی گئی تھیں تم بغیر تائے؟“  
گھر پہنچتے ہی اس نے ڈاکٹر ابھے اور نینا کو اپنا منتظر پایا۔ نینا بے تابی سے اس کے اندر آتے ہی پوچھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ابھے کے چہرے پر بھی غفلت نمایاں تھا۔  
”پریتی! کیا تمہیں یاد دلانا پڑے گا کہ تمہیں شام کے بعد بلا ضرورت گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔“ وہ ناراض ہو رہا تھا۔

”میرا جانا بہت ضروری تھا۔“ اس نے آج ہی سارا معاملہ صاف کرنے کا سوچا۔

”کل تک شاید بہت دیر ہو جاتی۔ یا تو مختار الیاسی نیوجرسی چلے جاتے۔۔۔ یا پھر آپ ایک بار پھر ان سے فرار حاصل کرنے کے لیے ہم سب کو لے کے نیویارک سے نکل جاتے۔“

کتنی ہی دیر تک ڈاکٹر ابھے سے نہ تو پلکیں جھپکی گئیں نہ ہی ایک لفظ تک بولا گیا۔ وہ ٹکڑ ٹکڑ اپنی بیٹی کی صورت دیکھ رہا تھا، اس کی رنگت دم بدم زرد پڑی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نینا یعنی مندی نے لڑکھڑاکے قریبی صوفے کا سہارا لیا۔

\*\*\*

”یہ آپ کا کامپلیکس تھا پایا! جو آپ دھرم کو ہر

وقت سر پہ سوار رکھتے تھے۔ یہ آپ کا گھٹ تھا جو آپ کو ہریل بھگوان کی مورتی کے آگے جھکنے پر مجبور کرتا تھا۔ آپ نہ بھگوان کے بنے نہ خدا کے۔ آپ نے اپنے دھرم کو بھی استعمال کی چیز بنایا اور اپنے دوست کے دھرم سے بھی فائدہ اٹھانا چاہا۔“ وہ ان دونوں کی کسی قسم کی وضاحت سننے پہ تیار نہ تھی۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو کہ میری پوجا پاٹ۔۔۔ یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔ میرا احساس جرم ہے؟“ ابھیجیت کلس اٹھا۔

”میں اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے آنسو صاف کئے، اور یہ کام وہ پچھلے آدھے گھنٹے میں دس بارہ مرتبہ کر چکی تھی۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں پایا! کہ میرے اندر بھی ایک مورت تھی، ایک آئیڈیل۔۔۔ ایک بھگوان میں نے بھی تراش رکھا تھا اور وہ آج ٹوٹ کے کرچی کرچی ہو گیا۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں پایا! کہ مجھے اپنے اس باپ کے روپ میں جو میرے لیے ایک مثالی باپ، مثالی شوہر اور مثالی انسان تھا، آج اسی باپ کے روپ میں ایک خود غرض باپ، بے رحم شوہر اور مطلبی دوست نظر آ رہا ہے۔“

”پریتی! یہ تمہارے پتا ہیں۔“ مندی نے سرزنش کی۔

”مگر یہ ایک انسان بھی ہیں اور ایک انسان کو انسانیت کی سطح سے اتنا بھی نہیں گرنا چاہیے۔ محبت واقعی اک عظیم جذبہ ہے۔ میں مان لیتی ہوں انہیں آپ سے بہت محبت ہوگی۔ لیکن محبت کیا فرائض سے بڑھ کے ہوتی ہے؟ ایک عورت کی محبت اور اس کی طلب ان پہ اتنی حاوی ہوگئی کہ وہ یہ بھول گئے کہ وہ ایک بے قصور عورت کے پتی اور دو معصوم بچوں کے پتا بھی ہیں۔ اتنے سالوں سے یہاں منہ چھپا کے بیٹھے ہوئے۔۔۔ اپنے سکھی پر یوار کے درمیان انہیں ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا کہ ان کا اپنا خون، ان کے اپنے بیٹے رام دیو اور شام دیو کس حال میں ہوں گے۔ مکمل، اہل اور نکھل کے لاڈ اٹھاتے ہوئے یہ فکر نہ



ہوئی کہ ان دونوں کو بھی باپ کی محبت اور شفقت کی ضرورت ہوگی؟“

”میں مجبور تھا۔۔۔ میں بہک گیا تھا پریتی! اور اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ وہ مختار جس نے تمہارے من میں زہر بھرا ہے۔ اس نے مجھے چکنی چڑی باتوں میں پھسلا یا تھا اسی نے میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کے میرے ذہن کو اس طرف۔۔۔“

”آپ دودھ پیتے بچے تو نہ تھے۔“ اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

”آپ نے دوستی کے نام پہ ان سے بھی کھیل کھیلایا۔ وہ آپ کے حسن تھے اور آپ نے غلط بیانی سے کام لے کر انہیں مشکل میں ڈالا۔ اور تو اور ان کے وہ عزیز رشتے دار جو آڑے وقت میں آپ کے کام آئے، آپ نے احسان فراموشی کرتے ہوئے ان پہ ہی الزام لگا ڈالا۔ اپنے محسنوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا تو کسی بھی دھرم میں نہیں سکھایا جانا پڑا۔“

”شٹ اپ پریتی۔“ اب ابھیجیت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ پھٹ پڑا۔

”میں کب سے تمہاری بکو اس سن رہا ہوں اور برداشت بھی کر رہا ہوں۔ اس مسئلے نے تمہارے اندر زہری زہر بھر دیا ہے۔ میں اسی لیے تمہارا ان لوگوں کے ساتھ میل جول پسند نہیں کرتا تھا۔ میرے پتا جی بھی مجھے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ تعلق رکھنے سے منع کرتے رہے۔ لیکن میں نے ان کی بات نہ مانی۔ مختار سے دوستی نے مجھے یہ دن دکھایا کہ میں کسی قابل نہ رہا، آج میری اپنی اولاد میرے منہ لگ رہی ہے، مجھے برا بھلا کہہ رہی ہے۔ صرف میری اس ایک غلطی کی وجہ سے۔۔۔ یہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔۔۔ چکنی چڑی باتیں کر کے، بھلا پھسلا کے کسی بھی طرح انسان کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ان کے دھرم میں آجائے۔ مجھے بھی دوسری شادی کا لالچ دیا گیا۔ سب سے پرکشش ہتھیار یہی ہے۔ تو ہے ان کے پاس۔“

”بس بیچے پاپا! آپ ان کے خلاف بول رہے ہیں جن لوگوں نے آپ کا مشکل وقت میں ساتھ دیا۔ آپ

اس دھرم کی برائیاں بیان کر رہے ہیں، جس دھرم نے آپ کو پناہ دی، ورنہ آپ کے اپنے دھرم نے آپ کی زندگی میں الجھنوں کے سوا اور کیا دے رکھا تھا، وہی اونچ نیچ، ذات پات۔۔۔ بھید بھاؤ۔“

”تم ایک برہمن کی بیٹی ہو اور بندو دھرم کو برا کہہ رہی ہو۔“ وہ شدت غم و غصہ سے کپکپانے لگا۔

”مجھے نہیں لگتا کہ میں کسی برہمن کی اولاد ہوں۔“ وہ بلک اٹھی۔

”مجھے یہ بھی نہیں لگتا کہ میں کسی مسلمان محمد علی کی اولاد ہوں۔۔۔ مجھے کچھ بھی نہیں لگتا پاپا۔! مجھے کچھ بھی۔“ اس کی دبی دبی سسکیاں رفتہ رفتہ آہوں اور پھر چیخوں میں بدل گئیں۔

”پریتی! سنبھالو خود کو۔“ مندی نے آگے بڑھ کے اسے ہاتھوں میں بھر لیا۔

”نہیں ہوں میں پریتی دیون، اگر میں کسی ابھیجیت مہادیون کی بیٹی اور اگر ایسا ہے تو سید عید اللہ شاہ نے میرے کان میں اذان کس حق سے دی تھی؟ اگر مجھے جنم دینے والی مندی کہنے ہی تو مجھے سیدہ زبیدہ خاتون نے دودھ کیوں پلایا؟“ وہ چلا رہی تھی۔ اس کا مچلتا ترپتا وجود مندی کے ہاتھوں میں بے قابو ہو رہا تھا۔

”میں تو فاطمہ علی بھی نہیں ہوں۔ اگر میں فاطمہ علی ہوں، محمد علی اور نورین علی کی بیٹی۔۔۔ تو میں کئی سالوں سے ہر روز صبح رام کی مورتی کے آگے ماتھایوں ٹیکتی ہوں؟“



”یہ تمہارا برتھ سرٹیفکیٹ۔“

ارباب نے اس کے آگے ایک پیپر رکھا۔

”انگل نے انڈیا سے منگوایا ہے۔“

”فاطمہ علی ولد محمد علی۔“ اس نے زیر لب اپنا وہ نام دہرایا جو اس کا غنڈہ لکھا تھا۔

”یہ کیا ہے؟۔۔۔ کل کے پیپر کے لیے بوٹی تو تیار نہیں ہو رہی؟“ منصف باقی دوستوں کے ساتھ ادھر



ہی چلا آیا۔

”بائی دی وے، کیا پرتی جانتی ہے کہ۔۔۔ بوٹی  
ایک چور سیلی ہوتی کیا ہے؟“ نیلم نے کہا۔

”تم بتا دو، تمہیں تو پتہ ہی ہو گا، وہاں پاکستان میں  
میٹرک، انٹر اور پھر ماسٹرز ایسے ہی تو نہیں کلیئر کر لیا ہو  
گا، ان ہی بوٹیوں کا کرم ہو گا۔“

”جہاں تک میری نالج ہے بوٹی غالباً“ جڑی بوٹیوں  
ٹائپ کا کوئی لفظ ہے۔ لیکن اس کا اسٹڈیز سے کیا تعلق  
ہے؟ کیا یہ کوئی ایسی بوٹی ہے جسے کھا کر دماغ زیادہ تیز ہو  
جائے؟“ ریحانہ نے اپنی معلومات جھاڑیں۔

”اگر ایسی کوئی بوٹی ہوتی تو میں تمہیں ضرور۔۔۔“  
منصف کہتے کہتے ٹھٹھکا تھا، اس کی اچھتی سی نظر۔۔۔  
نیبل پہ رکھے اس برتھ سرٹیفکیٹ پہ بڑی تھی۔ نہ تو  
اس برتھ سرٹیفکیٹ کا یہاں ہونا اچھے کی بات تھی۔  
نہ اس پر لکھا نام اسے چونکا نے کا باعث بنا تھا، اسے تو  
پرتی کا انداز غیر معمولی لگ رہا تھا۔ وہ چار روز کے بعد  
یونیورسٹی آئی تھی۔ دیکھنے میں ہی بہت زرد رو اور  
بکھری بکھری سی لگ رہی تھی۔ کم صم انداز۔۔۔  
شکستہ لہجہ اور تھکی ہوئی آنکھیں۔۔۔ اور اس وقت تو  
اس کی حالت صبح سے زیادہ خراب رہی تھی۔

”کیا ہوا پرتی؟ ارباز! یہ کس کا برتھ سرٹیفکیٹ  
ہے؟“ وہ پوچھے بغیر نہ رہ نہ سکا۔  
”فاطمہ علی کا۔“

”میرا۔“

پہلا جواب ارباز نے اور دوسرا ایک سیکنڈ کے  
توقف کے بعد پرتی نے دیا تھا۔ منصف ریحانہ اور نیلم  
اچھے ہوئے سے نظر آئے۔ ارباز نے ایک نظر بھر کے  
پرتی کی جانب دیکھا۔ اس کے ایک لفظ کے جواب  
سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس بات کو راز رکھنے کی  
خواہش مند ہر گز نہیں تھی، اس لیے اس نے بتانا  
شروع کیا۔

”یہ فاطمہ علی، میری بہن کا برتھ سرٹیفکیٹ  
ہے۔“

”تو یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟“ یہ نیلم کا ہونق پن سے

پوچھا گیا سوال تھا جبکہ منصف کی نظریں اب تک  
پرتی کے ندھال سراپے اور دھیان اس کے مختصر  
جواب پہ ٹھہرا ہوا تھا۔

”لیکن پرتی تو کہہ رہی تھی کہ یہ اس کا۔۔۔؟“

”ہاں، پرتی ہی میری بہن فاطمہ علی ہے۔“ اس  
نے مختصر ”سارا قصہ سنایا۔“

”امیزنگ۔“ یہ نیلم سرور کا تبصرہ تھا۔ ”اور  
فتنا شک بھی، یعنی اب پرتی۔۔۔ یعنی کہ فاطمہ ہماری  
اپنی ہے۔“

اس پہ ریحانہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تو  
وہ خفیف سی ہو گئی۔

”میں کس کی اپنی ہوں اور کس کے لیے غیر۔۔۔ یہ تو  
میں خود بھی نہیں جانتی۔“ پرتی کے کہنے پہ منصف  
اپنے خیالوں سے چونکا۔

”یہ جاننے سے پہلے تمہیں یہ جاننا چاہیے کہ تم خود  
کون ہو؟۔۔۔ تم فاطمہ علی ہی ہو۔“

”لیکن میں۔۔۔“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اس نے  
ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔

”شاید مجھے تمہیں یہ نہیں بتانا چاہیے بلکہ مجھے تو  
کیا، کسی کو بھی نہیں۔ یہ تمہاری اپنی پہچان ہے اور  
اسے تمہیں ہی تلاش کرنا ہے۔ میرا مشورہ صرف اتنا  
ہے کہ اس پہچان کو کسی سارے کے بغیر تلاش کرو گی  
تو زیادہ کامیاب رہو گی، ورنہ شاید تمہارے دل میں یہ  
کھٹک رہے کہ تمہیں جو پہچان ملی، وہ تمہاری اپنی  
کھوج نہیں بلکہ کسی کی عطا کردہ ہے، میرا مطلب تم  
سمجھ گئی ہو گی۔“

”شاید تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مجھے اپنے پیرنٹس  
سے الگ ہو کے اپنی شناخت بنانا چاہیے۔“

”ہاں، اگر تم اسے مناسب سمجھو، میں جانتا ہوں کہ  
یہ مشکل ضرور ہے۔ چلو کم از کم تم اتنا تو کر سکتی ہو کہ  
ان کی دی ہوئی شناخت پہ اکتفا کرنے کے بجائے۔“

”بات بالکل صاف ہے۔“ ارباز نے بے صبری  
سے بات کا لی۔

”یہ فاطمہ ہے۔۔۔ یہ فاطمہ بن کے پیدا ہوئی تھی۔“



”نہیں ماما! میں چھوڑ نہیں رہی، میں صرف کچھ عرصے کے لیے آپ سے الگ ضرور ہونا چاہتی ہوں کیونکہ اب تک میں یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ میرا آپ کے ساتھ رہنا درست ہے یا نہیں۔“

”اور یہ وہم کس نے بھرا تمہارے اندر اسی مختار الیاسی نے؟“ ابھیجیت نے پھنکارتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ہاں۔۔۔“ اس نے بغیر جھجکے تسلیم کیا۔ ”وہ کہتے ہیں کہ میں مسلم ہوں، پیدائشی مسلمان۔۔۔ میرا ہندو گھرانے میں رہنا جائز نہیں۔“

”اس نے کہا اور تم نے مان لیا؟“  
 ”مانا نہیں۔۔۔ لیکن پوری طرح جھٹلا بھی نہیں پا رہی۔“ وہ الجھی ہوئی نظر اڑ رہی تھی۔

”میں نے جو غلطی کی، مانتا ہوں اس میں سراسر میری غرض شامل تھی، میں مجبور ہو چکا تھا مگر تم کس مجبوری کے تحت گمراہ ہو رہی ہو۔ نہیں پریتی! میں جانتے بوجھتے تمہیں یہ پاپ نہیں کرنے دوں گا۔“ وہ تڑپ اٹھا۔

”اور وہ کیا تھا، جو آپ نے کیا، کیا وہ پاپ نہیں تھا؟“  
 اس نے ابھیجیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے سوال کیا تو وہ نظریں چرا گیا۔

”میں نے بے شک اس کے ہر کاوے میں آکر اسلام قبول کیا۔ مگر دل سے نہیں۔ میں اب بھی اپنے دھرم پہ سچے دل سے قائم ہوں۔“

”یہی تو پاپ ہے، جیسے آپ سمجھ نہیں رہے۔ رشتوں، دوستی اور محبت کے نام پر خود غرضی کا مظاہرہ کرنا کوئی بھی دھرم نہیں سکھاتا۔ کسی کتاب میں بھی ذمہ داریوں سے منہ موڑنا نہیں سکھایا گیا۔ آپ کو یہ تو یاد رہا کہ آپ نے اپنے بھگوان کے بجائے چند دن کسی اور کی پوجا کی، چاہے اوپر ہی دل سے ہی سہی، دکھاوے کے لیے ہی سہی۔۔۔ لیکن کی اور یہ احساس جرم اتنے سال بعد بھی آپ پہ حاوی رہا لیکن پاپا! آپ کو اپنے دوسرے پاپ یاد نہیں؟ آپ نے ان بیس سالوں میں ان کو دھونے کے لیے کیوں نہیں کچھ کیا؟ اپنی خود غرضی میں آپ ان دو معصوم بچوں کو بھول گئے جن کو

اگرچہ اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون میرے اندر بہتے خون سے الگ ہے مگر ہمارے اندر ایک ہی پاکیزہ دودھ کی مٹھاس ہے اور وہ دودھ ایک مومنہ ماں کا ہے۔ یہ کسی ابلھے یا ابھیجیت اور نندی یا نینا کی نہیں بلکہ محمد علی اور نورین علی کی بیٹی بن کے پیدا ہوئی تھی اور یہی اس کی پہچان ہے۔“ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

”نہیں، میں تمہارے فتوے پہ ایمان کیسے لے آؤں۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”منصف ٹھیک کرتا ہے۔ کسی کی عطا کردہ شناخت یا دیا ہوا نام مجھے تسلی نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنی پہچان خود تلاشی ہے۔ مجھے جانتا ہے کہ پریتی دیون ہونے میں میری نجات ہے یا فاطمہ علی بننے میں۔“

”اس کے ذہن کو مت الجھاؤ ارباز! اسے اپنا رستہ خود منتخب کرنے دو۔“ اس کے جانے کے بعد منصف نے سمجھانا چاہا۔

”میں اسے اس کے حال پہ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ وہ میری بہن ہے منصف۔۔۔ میری بہن۔ اسے رستہ دکھانا میرا فرض ہے۔ وہ گمراہ ہو سکتی ہے۔“

”نہیں، اسے گمراہ ہونا ہوتا تو اب تک جس تاریکی میں رہ رہی تھی وہ تاریکی اسے نگل چکی ہوتی، وہ خود کو بغیر جھجکے پریتی دیون بتاتی۔۔۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر رہی۔ اگر وہ خود کو فاطمہ علی تسلیم نہیں کر رہی تو پریتی ماننے سے بھی انکاری ہے۔ اس کا تذبذب ظاہر کرتا ہے کہ وہ دورا ہے یہ کھڑی ہے، یھین رکھو، وہ غلط راستے کا انتخاب نہیں کرے گی۔“

”اللہ کرے، تمہارا اندازہ درست ہو۔“

”یہ میرا اندازہ نہیں ارباز! میرا ایمان ہے۔“ اسے اسی رستے پہ آنا ہے بالآخر۔ کہ اسی رستے پہ میں اس کا منتظر ہوں۔“ اس کے دل نے پورے یقین سے کہا تھا۔



”تم یہ گھر چھوڑ کے جا رہی ہو؟ ہمیں چھوڑنا چاہتی ہو؟“ نندی دکھ سے کراہ اٹھی۔



برہہ کر اسے تھا مناجاہا مگر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔  
 ”دکڑ سکتی ہوں مانا! اگر گوئی پنڈت آپ کو معاف کر  
 دے اور اگر رام دیو اور شام دیو پاپا کو معاف کر دیں۔  
 وہ سارے سال جو انہوں نے بتا کے ہوتے ہوئے  
 انا تھ (یتیم) بن کے گزارے۔ اگر انکل مختار آپ  
 دونوں کو معاف کر دیں وہ غم جو دوستی کا بھرم ٹوٹنے پر  
 انہوں نے جھیلا۔ اور اربازی فیملی آپ کو معاف کر  
 دے وہ ذلت جو انہوں نے آپ سے بھلائی کرنے کے  
 صلے میں پائی۔ اگر یہ سب آپ کو معاف کر دیں تو شاید  
 میرا دل آپ کے ساتھ رہنے پہ راضی ہو جائے  
 کیسے پایا! کیا آپ اندیا جانے کے لیے تیار ہیں؟“  
 ”نہیں۔“ ایبھیجیت کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔

”وہاں جانے کا مطلب ہو گا سب کو چھوڑنا، ننڈنی  
 کو، تمہیں نکھل، مکمل اور اہل کو۔۔۔ مجھ میں اب  
 اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ تم سب میرا ٹوٹا انگ ہو میں  
 جانتا ہوں، رام اور شام کی طرف بھی میری بہت سی  
 ذمہ داریاں ہیں لیکن یہ ذمہ داریاں نبھانے کے لیے  
 میں تم سب سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ میں نے برسوں  
 میں یہ اشیانہ بنایا ہے، میرا واپس ہندوستان لوٹنا میرے  
 اس گھر کو تھس تھس کر کے رکھ دو۔ رگلا، تمہاری طرح  
 وہ بھی مجھے کئی شرطوں کے بعد معاف کرنے پہ تیار  
 ہوں گے اور جانتی ہو ان میں سب سے بڑی اور سب  
 سے تکلیف دہ شرط کیا ہوگی؟۔۔۔ کہ میں اپنی اس  
 دوسری شادی کو ختم کر دوں۔ میری مجبوری سمجھنے کی  
 کوشش کرو بیٹا۔! میں۔۔۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔  
 کبھی بھی نہیں۔“

پریتی نے ایبھیجیت کو ہمیشہ ایک مضبوط باپ کے  
 روپ میں دیکھا تھا، اس سے اپنی آنکھوں کے سامنے  
 اس کا گڑ گڑاتا اور بے بسی سے سسکا اٹھنا برداشت نہ  
 ہوا۔ وہ پل میں پکھل سی گئی۔ اس نے صوفے پہ  
 ندھال سے بیٹھے باپ کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا۔  
 ”کاش۔۔۔ کاش پایا!۔۔۔ کاش آپ مسلمان  
 ہوتے۔“ اچانک بالکل ہی بے ارادہ اس کے منہ سے  
 یہ الفاظ نکلے۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر ایبھیجیت کے

عمر کے اس دور میں سب سے زیادہ ضرورت ایک پتا کی  
 تھی۔ آپ نے پلٹ کر یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں  
 کی کہ آپ کی بوڑھی بیوہ ماں اب تک زندہ بیٹھی آپ  
 کی راہ تک رہی ہے یا اس کا انتظار تھک کے ہمیشہ کے  
 لیے سوچ چکا ہے۔ کیا اسے آپ باپ نہیں سمجھتے؟“  
 وہ انسان جس نے دوستی کے جذبے کے تحت اور  
 آپ کی محبت کو آپ سے ملانے کی خاطر آپ کو ایک  
 راہ دکھائی۔ اس نے اس دوستی کے بدلے آپ سے  
 بے عزتی پائی۔ اس کا باپ اس الزام کو لے کے گزر گیا  
 اور آپ، آپ اب بھی کتنے آرام سے یہاں اپنے  
 پر یوار میں راضی خوشی بیٹے اپنی غلطی اس پہ تھوپ  
 رہے ہیں۔ وہ فیملی جس نے ایک سال تک آپ کو  
 اپنے گھر میں پناہ دی، اس کی محبت اور خلوص کا کیا صلہ  
 دیا آپ نے؟ آپ واپس اپنے دھرم کی طرف لوٹ  
 جاتے نہ رہتے مسلمان لیکن، لیکن اپنے بے قصور  
 محسنوں کے ساتھ ایسا انسانیت سے گرا ہوا سلوک تو  
 نہ کرتے کہ آئندہ کوئی کسی پہ احسان کرنے سے پہلے  
 سوار سوچے۔“

”اس کے سوا میرے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔  
 مجھے وہاں سے نکلنا تھا، نہ صرف اس گھر سے بلکہ اس  
 دلش سے۔“ اس انداز میں پشیمانی اور ندامت کی کوئی  
 رمت نہ تھی۔ پریتی نے تاسف سے اپنے باپ کو  
 دیکھا۔

”ایبھیجیت سے محبت تو دل کو نرم کر دیتی ہے پایا! اس  
 کے قریب ہونے کا مطلب ہے برائی سے دور ہونا۔  
 اگر آپ کو اپنے بھگوان سے سچ محبت ہوتی، اگر آپ  
 کے دل میں واقعی اس کا خوف ہوتا تو آپ اس کو  
 ناراض کرنے کا نہ سوچتے۔ آپ اس کے اتنے  
 سارے بندوں کا دل نہ دکھاتے۔ یہ کیسا دھرم ہے پایا  
 ۔! یہ کیسی پوجا ہے آپ کی کہ اس پتھر کی مورتی کا تو  
 آپ اتنا دھیان رکھتے ہیں اور کالج جیسے دل توڑ دیتے  
 ہیں۔“ اس کے بھرائے لہجے پہ ایبھیجیت کا سر اور  
 نظریں دونوں جھک گئیں۔

”کیا تم ہمیں معاف نہیں کر سکتیں؟“ ننڈنی نے



شانے سے ہٹ گیا۔ نڈھال سے قدموں کے ساتھ وہ گھر سے نکل گئی۔

\*\*\*

”اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ مجھے جو بات سب سے زیادہ ناگوار گزرتی تھی اور جسے میں ایک ظالمانہ عمل جانتی تھی اس میں بھی ایک مصلحت چھپی ہوئی ہے۔“ وہ سارہ سے کہہ رہی تھی۔

”ہم ارباز سے... منصف اور نیلم سے اکثر اسی ایک معاملے پر الجھ جایا کرتے تھے ناں کہ تمہارے مذہب نے مرد کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دے کے عورت کے حقوق سلب کیے ہیں۔ لیکن کل پیلا سے بات کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ قانون تو حقوق کو تحفظ دیتا ہے نہ کہ انہیں ختم کرتا ہے۔ کیا ہم چاروں بہن بھائی اور پیلا کے پہلے دونوں بیٹے ایک جیسے حقوق نہیں رکھتے؟ لیکن پیلا ہم سب کے حقوق اکٹھے پورے کرنے سے قاصر ہیں۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو کہ صرف اسی ایک مثال کی وجہ سے تم مرد کی چار شادیوں کو جائز نہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے بات کاٹی۔ ”تم میرا مطلب نہیں سمجھیں میں صرف یہ کہہ رہی تھی کہ یہ تو صرف ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ جس طرح اسلام کے اس قانون کے بارے میں اور بہت سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمارے دوسرے شکوک و شبہات بھی کھوکھلے ہوں۔ ہم نے کبھی انہیں جاننے اور ان سے کسی قسم کی وضاحت حاصل کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی۔ بس سنی سنائی باتوں پر یہ فرض کر کے بیٹھ گئے کہ اسلام ایک انتہا پسند مذہب ہے اور تمام مسلمان دہشت گرد، تشدد پسند، بنیاد پرست اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔ حالانکہ میں اپنی زندگی میں اب تک جتنے بھی مسلمانوں سے ملی ہوں وہ اس کے بالکل برعکس ہیں اور انکل مختار الیاسی سے جن کے بارے میں ذکر سنا ہے وہ بھی مجھے کوئی افسانوی کردار لگتے ہیں۔ تم ہی بتاؤ ایسے کیسے کوئی کسی انجان کو ہر خطرے کی

پردہ کیے بغیر اپنے گھر میں ٹھہراتا ہے؟ خون کے رشتے سے بڑھ کے اپنائیت دیتا ہے، کسی غیر کی اولاد کو اپنا دودھ پلاتا ہے؟“

”پتہ نہیں پرتی! تم کن باتوں میں الجھ گئی ہو۔“

سارہ نے سخت آکٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا فرق پڑتا ہے اس بات سے کہ تم فاطمہ تھیں اور اب بریتی ہو۔ یا تمہارے پیرئٹس نے کچھ عرصے کے لیے کسی اور مذہب کو اختیار کیا تھا اور اگر کیا بھی تھا تو ان کی مرضی، تمہیں کیا اعتراض ہے بھلا؟ اور اگر تم فاطمہ علی کہلانا چاہتی ہو تو انہیں بھی اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی زندگی جیتا ہے، کسی دوسرے کو دخل دینے کی ضرورت ہی نہیں۔“ اس نے بات ہی ختم کر دی۔

”شاید میں غلط انسان سے مشورہ مانگنے چلی آئی۔“

اس نے گہری سانس لے کر اپنا بیگ اٹھایا۔ ”کم آن بریتی! ہمیں میرا مشورہ فضول لگ رہا ہے تو جانے دو، مت لو میری رائے۔ لیکن یہاں سے جاؤ تو مت۔“ سارہ نے اسے روکنا چاہا۔

”جانتی ہو سارہ! میں تمہاری طرف، کیوں آئی تھی۔“ اس نے جاتے جاتے پلٹ کے بتانا چاہا۔

”میں چاہتی تو نیلم یا ریچا کے ہاں بھی جاسکتی تھی۔ لیکن نیلم کے گھر میں اس لیے نہ گئی کہ وہ اور اس کی فیملی پاکستانی مسلمان ہیں بقول تمہارے ساری دنیا کے مسلمانوں میں سب سے خالص اسلامی ذہنیت والے۔ میں منصف کے کہنے کے عین مطابق اپنی آئندہ زندگی کا فیصلہ صرف اور صرف اپنے دل کے مطابق کرنا چاہتی ہوں جبکہ نیلم کے گھر مجھے اکسانے اور اسلام کی جانب زبردستی مائل کرنے والے بہت سے لوگ ملتے۔ ریچا کے ہاں نہ جانے کی بھی یہی وجہ تھی۔ وہ میرے پیرئٹس کے دھرم کی ہے اس کی ہمدردیاں ان کی طرف ہوتیں۔ شاید اس کی باتوں سے گھبرا کے میں ایک بار پھر ان کی جانب لوٹ جاتی۔“

”تو تم چاہتی کیا ہو؟“

”میں چاہتی ہوں کہ میں جو بھی فیصلہ کروں وہ میرا



تارڑ کا ہاتھ تھامنے کے لیے نہیں اور اگر میں یہ ہاتھ جھٹک دیتی ہوں تو۔۔۔

اس نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھا۔ وہاں ایک دم سے ایک ہولناک سناٹا چھا گیا تھا۔



”میں جانتا تھا، تم یہیں آؤ گی۔“

ارباب نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہی اسے سامنے پایا تو کہہ اٹھا۔

”لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ میرے قدم مجھے وہیں لے آئیں گے جہاں میں نہیں جانا چاہتی۔“ وہ اپنے تھکے ہوئے قدم گھسیٹتی اندر کی جانب بڑھی۔

”یہ تمہارے بھائی کا گھر ہے فاطمہ!“

”پلیز مجھے فاطمہ مت کہو۔“

”میں تمہیں پریتی بھی نہیں کہہ سکتا۔“ اس کے جواب پہ وہ زخمی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

”یعنی تم مجھے یہ احساس دلانا چاہتے ہو کہ میں بے نام ہوں۔۔۔ اتنی زحمت مت کرو ارباب! یہ احساس مجھے پہلے سے ہے۔“

”میں تمہیں بہنا کہوں گا“ بے نام ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، صرف بے حیثیت نہیں ہونا چاہیے اور جب جب میں تمہیں بہنا کہہ کے پکاروں گا، تمہیں اپنی حیثیت اور مقام کا احساس ہو گا۔ وہ حیثیت اور وہ مقام جو میری زندگی میں تمہارا ہے۔“ اس نے پریتی کے سر کو سہلایا۔ اس کی ساری تکان اور اضمحلال یکدم دور ہونے لگا۔

”اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔“

وہ گہری نیند میں تھی جب اس کا خوابیدہ اور بوجھل دماغ اس پکاریہ چونک اٹھا۔ اس نے آنکھیں کھول کے کمرے کی تاریکی میں وقت کا اندازہ لگانا چاہا، پھر سر ہانے سے اپنا موبائل اٹھا کے ناٹم دیکھا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے اور یہ آواز باہر لوٹنگ روم سے آرہی تھی۔ وہ سلیپر



”اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔“

وہ گہری نیند میں تھی جب اس کا خوابیدہ اور بوجھل دماغ اس پکاریہ چونک اٹھا۔ اس نے آنکھیں کھول کے کمرے کی تاریکی میں وقت کا اندازہ لگانا چاہا، پھر سر ہانے سے اپنا موبائل اٹھا کے ناٹم دیکھا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے اور یہ آواز باہر لوٹنگ روم سے آرہی تھی۔ وہ سلیپر

اپنا ہو، کسی کے دباؤ میں آکر کوئی قدم نہ اٹھاؤں ورنہ پاپا کی طرح اپنے اس اقدام کا الزام دوسروں پہ رکھ کے ساری عمر پچھتاتی رہوں گی۔ اسی لیے میں تمہاری طرف آئی تھی تاکہ یکسوئی سے اپنی زندگی کے پارے میں کچھ فیصلے کر سکوں، میں تمہیں نیوٹل جانتی تھی۔ میرا خیال تھا، میں جو بھی رستہ چنوں گی۔ تم اس میں حائل نہیں ہو گی، اپنے نظریات مجھ پہ ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرو گی۔ لیکن میرا یہ خیال غلط تھا۔ تم مجھ پہ اپنے نظریات کیا مسلط کرو گی سارہ! تمہارا تو سرے سے کوئی نظریہ ہی نہیں۔ تم کسی کی زندگی پہ اثر انداز کیسے ہو سکتی ہو، کیسے کسی کو اپنے راستے پہ چلا سکتی ہو جب کہ تم خود رستے سے بھٹکی ہوئی ہو۔ اب سے کچھ دیر قبل میں خود کو اس دنیا کی سب سے بد قسمت لڑکی سمجھ رہی تھی، جس کے پاس نہ تو اس کی ذاتی شناخت ہے نہ اصل نام۔۔۔ نہ زندگی گزارنے کا کوئی لائحہ عمل اور نہ ہی کوئی منزل لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ سب سے بد قسمت تو تم ہو۔ میرے پاس کچھ نہیں، مگر کچھ پانے کا مقصد تو ہے، اپنی پہچان حاصل کرنے کی لگن تو ہے، منزل نہیں مگر اس کی گھوج تو ہے اور میں ایک نہ ایک دن یہ سب پالوں گی۔ لیکن تم۔۔۔ تم سارہ۔۔۔ تمہارے پاس سب ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں۔ تم نے اپنی شناخت اپنے ہاتھوں گنوائی ہے۔“

”تم پہ منصف کا اثر ہو گیا ہے۔“ اسے جاتے جاتے اپنے عقب سے سارہ ڈیوڈ کا زہر خند فقرہ سنائی دیا تھا۔

”ہاں“ اثر تو ہوا ہے، بہت گہرا۔۔۔ مگر فی الحال میں اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی۔“ اس نے سوچا۔

”میں بھی جانتی ہوں کہ اس کے ہاتھ میری جانب کب سے ایک آس لیے بڑھے ہوئے ہیں لیکن آج میں جس دوراں پہ کھڑی ہوں، وہاں میں نہ تو اس کا ہاتھ تھام سکتی ہوں نہ ہی جھٹک سکتی ہوں۔ ہاتھ تھانے کا مطلب ہو گا، فاطمہ علی بننا اور میں اگر فاطمہ علی بننا چاہوں گی تو صرف اپنے لیے، کسی منصف علی



پہن کے باہر نکلی۔ لونگ روم میں بھی لائٹس آن تھیں۔ مگر نہ ارباز تھانہ انکل مختار البتہ ٹیپ ریکارڈر سے اذان کی آواز گونج رہی تھی۔ بے ساختہ وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔

یہ الفاظ اس کے لیے مانوس مگر زبان ناقابل فہم تھی۔ وہ ان الفاظ کا مفہوم جاننا چاہتی تھی جو اسے اپنی جانب مقناطیس کی طرح کھینچتے تھے۔

”کیا سوچ رہی ہو بہنا؟“ واش روم سے ارباز تو لیے سے ہاتھ منہ خشک کرتا نکلا تو اسے کسی گہری سوچ میں گمپا کے سوال کیا۔

”یہ۔۔۔ یہ اذان؟“ اس نے ٹیپ ریکارڈ کی جانب اشارہ کیا۔

”ہاں یہ اذان۔“ اس نے قبلہ کی جانب جہ نماز بچھائی۔

”ویسے تو یہاں گھڑی یہ وقت دیکھ کے نماز ادا کی جاتی ہے لیکن مجھے صبح کی نماز میں مزا ہی تب آتا ہے جب اذان سنتے ہوئے وضو کیا جائے۔ اس لیے میں نے اذان کی آواز ٹیپ کر کے رکھی ہوئی ہے۔ تم اگر کافی بنا رہی ہو تو ایک کپ میرے لیے بھی بنانا۔ میں نماز ادا کر کے پیتا ہوں۔“ اس نے اتنا کہنے کے بعد نیت باندھ لی۔ پریتی نے ٹیپ ریکارڈ میں سے کیسٹ نکالی اور مٹھی میں دبا کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”کل ایک عجیب سی بات ہوئی منصف۔“ اگلے دن وہ اسے بتا رہی تھی۔

”میں نے ارباز کی اذان والی کیسٹ سنی اور ایک بار نہیں بار بار سنی اور جانتے ہو ایسا میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ میں جیسے مجبور سی ہو گئی تھی یوں لگ رہا تھا اذان کے وہ الفاظ مجھے کسی ظلم میں جکڑ رہے ہوں۔ میں ان کا مطلب نہیں جانتی وہ کسی اور زبان میں ہیں لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ وہ زبان بڑی مقدس ہوگی اور وہ الفاظ۔۔۔ وہ الفاظ بہت غیر معمولی۔ کیا کہتے ہیں وہ الفاظ مجھ سے منصف؟“

”یہ اذان تمہیں یاد دلاتی ہے کہ اس دنیا میں آنے کے بعد تمہاری سماعتیں اللہ کے اسی حکم سے آشنا

ہوئی تھیں۔ جب بھی کسی مسلمان گھرانے میں کوئی نئی روح جنم لیتی ہے تو اس کے کان میں اذان دینے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان وہ رشتہ قائم ہو جائے جو اسے اللہ کے بتلائے رستے پہ چلنے کی توفیق عطا کرتا ہے اور شاید وہی رشتہ جو ارباز کے دادا نے تمہارے کان میں اذان دے کے بنایا تھا وہی تمہیں اذان کے ان الفاظ کی جانب کھینچتا ہے۔ اذان اللہ کی جانب بڑھنے کا حکم دیتی ہے کیا تمہیں۔۔۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے؟“

”پتہ نہیں، لیکن مجھے لگتا ہے جیسے کوئی مجھے بلاتا ضرور ہے اب نجانے وہ اللہ ہے یا۔“

”یہ پتہ لگانا تمہارا کام ہے۔“ منصف نے شانے اچکا کر ”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہ راستہ جو تم اپنی صوابدید سے منتخب کر لو گی اس پہ چلتے ہوئے تمہارے قدم زیادہ مضبوطی اور خود اعتمادی سے اٹھیں گے۔“

زندگی کی تلخ حقیقتوں سے گندھی آپ بیتیاں جگ  
بیتیاں..... سچی داستانوں پر مشتمل

## عمران ڈائجسٹ

کا تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے۔

آپ بھی اپنی زندگی سے متعلق کوئی سچا واقعہ کہانی لکھ کر ہمیں بھجوائیں ہم اس کی نوک پلک سنوار کر اسے عمران ڈائجسٹ کی سچی داستانوں کی زینت بنائیں گے۔

انچارج شعبہ ”سچی داستانیں“

ماہنامہ عمران ڈائجسٹ 37۔ اردو بازار کراچی



گفتگو ہوگی۔“ کہتے کہتے وہ خود ہی ہنس پڑا پھر اس کے  
سنجیدہ چہرے کو دیکھ کے کہنے لگا۔

”تم کس چیز سے خوف زدہ ہو؟ کون تمہارا دامن  
تھامے ہوئے ہے؟ میں صاف محسوس کر سکتا ہوں کہ  
اس وقت تمہارے دل میں کیا ہے اور تم کیا چاہتی ہو،  
تمہارے قدم جس جانب بڑھنا چاہتے ہیں تم انہیں  
بڑھنے کیوں نہیں دیتیں؟ تمہارا دل تمہیں جس رستے  
کو چننے۔ اکسار رہا ہے، تم بلا جھجک اس کو اختیار کیوں  
نہیں کر لیتیں۔ اذان کی آواز تمہیں بلاوے دیتی ہے،  
کیا پھر بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کون  
اپنی جانب بلا رہا ہے یا پھر تم جان کر بھی انجان بن رہی  
ہو۔ تمہیں سہارا چاہیے۔ میں دے سکتا ہوں مگر ابھی  
نہیں۔ تمہیں مدد چاہیے، میں کر سکتا ہوں لیکن اس  
سے پتہ ہے کیا ہوگا؟ یہ جو تمہارے اندر ایمان کی ایک  
روشنی سی پھوٹ رہی ہے اور جس کا نور میں تمہارے  
چہرے پہ بخوبی محسوس کر سکتا ہوں، اس کی چمک ماند پڑ  
جائے گی۔ یہ ایمان۔ اور حق کی طلب تمہارے اندر  
یونہی نہیں جاگی یہ ایک مومن ماں کے دودھ کا اعجاز  
ہے۔ یہ ایک زائد و پرہیزگار شخص کی تمہارے کانوں  
میں دی گئی اذان کی کرامات ہیں۔ یہ تمہیں سنائے  
گئے درود شریف کی برکت ہے۔ کسی کا سہارا لے  
کے اس سعادت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا جو تمہارا  
نصیب بننے والی ہے۔“



”تم بہت کٹی ہو فاطمہ۔“ سارہ ڈیوڈ نے اسے گلے  
لگاتے ہوئے حقیقی مسرت سے لبریز لہجے کے ساتھ  
کہا۔

”ہمارے دلش کی دلہنیا وداع ہو کے تمہارے  
دلش میں جا رہی ہے جی جاجی! خیال رکھیے گا۔“ راجا  
نے اسے چھیڑا۔

”کتنی عجیب سی بات ہے پاکستان میرا میکہ ہے،  
اور امریکہ سسرال جبکہ میری دوست اپنا یہ میکہ چھوڑ

”تمہارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہی میں  
نے بابا کا گھر چھوڑا تھا تاکہ میں کسی دباؤ میں آئے بغیر سچ  
اور جھوٹ کا فیصلہ کر سکوں، تاکہ ان کی محبت مجھے کمزور  
نہ کر دے لیکن منصف چند ہی دنوں میں مجھے اندازہ ہو  
رہا ہے کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ میرے قدم ابھی سے  
لڑکھٹارے ہیں۔ ایک دھند سی ہر جانب چھائی ہوئی  
ہے، کبھی منظر صاف ہونے لگتے ہیں تو رستہ بھول جاتی  
ہوں، کبھی رستہ یاد آجائے تو پیر شل ہونے لگتے ہیں۔  
مجھے کسی سہارے کی، کسی کی مدد کی ضرورت ہے  
منصف۔ کسی کی انگلی تھامے بغیر یہ سفر طے کرنا میرے  
لیے بہت دشوار ہے، بہت دشوار۔“ اس نے بے بسی  
سے منصف کو دیکھا۔

”کیا تم میری مدد کرو گے؟“

”میں؟“ منصف نے اس کی آنکھوں میں ڈھکے  
چھپے مفہوم سے انجان بنے ہوئے پوچھا۔  
”سوچ لو، میں تو بس ایک ہی راستہ جانتا ہوں، اگر  
میں نے تمہاری انگلی تھامی تو سیدھا اسی جانب لے کے  
جاؤں گا۔“

وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی۔

”اگر میری مرضی نہ ہوئی تب بھی؟ میں نے تم سے  
مدد ہی تو مانگی ہے، یہ اختیار تو نہیں دیا کہ تم جہاں جی  
چاہے مجھے لے جاؤ۔ یہ تم نے ہی کہا تھا کہ مجھے اپنی  
منزل کسی کے کہنے پہ نہیں، صرف اپنے دل کے کہنے پہ  
منتخب کرنا ہے۔“

”لیکن اگر دل اپنے کہنے میں نہ ہو۔۔۔ کسی اور کے  
کہنے میں ہو، تب اس دوسرے کی بات پہ ہی کان دھر  
لینے چاہئیں۔“ وہ مسکرایا، پریتی جل سی ہو گئی جیسے دل  
کا چور پکڑا گیا ہو۔  
”کیا مطلب؟“

”مطلب سمجھاؤں گا اور ضرور سمجھاؤں گا مگر ابھی  
نہیں۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ ابھی اس کا مطلب  
سمجھانے کا مطلب ہو گا کہ میں نے تمہیں اپنے  
مطلب کے لیے۔۔۔ یہ تو کچھ زیادہ ہی مطلبی قسم کی



”بس کچھ وقت جاتا ہے، جب ہم منزل پہ پہنچ جائیں گے۔“ اس نے فاطمہ کے مہندی سے رپے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”منزل؟“ اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی، ”کیا ابھی منزل پہ پہنچنا باقی ہے منصف؟ کیا ابھی کچھ اور رہتا ہے حاصل کرنے کو؟ جو کچھ ملا ہے اس پہ تو جی بھر کے خوش ہو لینے دو، اللہ کا شکر ادا کر لینے دو۔“

”خوش تو میں بھی ہوں فاطمہ اور اللہ کا شکر بھی ادا کرتا ہوں کہ تم نے بالآخر حق کو پایا اور اسی طرح پایا، جیسے کہ میری خواہش تھی۔۔۔ میں چاہتا تھا، تم جب راستے میں آنے والی سب صعوبتوں کا سامنا کرتی، ہر رکاوٹ کو ہٹاتی اپنی منزل پہ پہنچو تو میں وہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ میں اس چیز سے بچنا چاہتا تھا کہ تم پہلے مجھے حاصل کرتیں پھر میرے راستے یہاں تک پہنچتیں، تمہیں اسلام مجھ سے شادی کرنے کی خاطر بھی تسلیم کرنا پڑتا مگر اس طرح مسلمان بننے میں اور اس طرح مسلمان ہونے میں بہت فرق ہوتا۔ اللہ کا شکر ہے میں تمہارے اور تمہارے ایمان کے درمیان نہیں آیا۔“

”ہاں، اب مجھے احساس ہو رہا ہے، تمہارے اس مشورے کے پیچھے کیا حکمت عملی تھی۔ کسی چیز کا مل جانا اتنی بڑی بات نہیں، جتنی خوشی اسے حاصل کر لینے میں ہوتی ہے۔ تم سے۔۔۔ یا کسی اور شادی کر لینے کی صورت میں بھی میں مسلمان کہلاتی مگر مسلمان ہونے کے بعد تمہاری بیوی کہلانے میں مجھے فخر محسوس ہو رہا ہے۔“

اس نے طمانیت سے اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا۔

کے میرے وطن سرال میں بسنے جارہی ہے۔“ یہ نیلم حیات تھی جو ابھی کل تک۔ نیلم سرور تھی اور جس سے گلے مل کے وہ الوداعی آنسو بہا رہی تھی وہ فاطمہ منصف تھی، جو ابھی کل تک پریتی دیون تھی۔ نیلم ہی کی شادی کی تقریب میں ان دونوں کا بھی نکاح بڑھایا گیا۔ اور آج ہی منصف اسے لے کر اپنے وطن پاکستان لوٹ رہا تھا۔

”میرے گھر کو بھی اپنا میکہ ہی سمجھنا فاطمہ! میں نے صرف نکاح کی کارروائی پوری کرنے کے لیے تمہارا ولی ہونے کا کردار ادا نہیں کیا بلکہ میں حقیقتاً ہمیشہ کے لیے یہ ذمہ داری ایک فرض سمجھ کے قبول کرتا ہوں۔“

مختار الیاسی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کے دعائیں دیتے ہوئے ایک بار پھر یاد دلایا۔

”وہاں تو مجھے آنا ہی ہو گا انگل! خصوصاً حیدر آباد میں وہ گھر۔۔۔ وہ آنگن دیکھنا چاہتی ہوں جس نے میری ماں کو پناہ دی۔۔۔ گویا مجھے ایک مسلم گھرانے میں۔۔۔ مومن اور نیک لوگوں کے درمیان پیدا ہونے کی سعادت حاصل کرنے کا موقع دیا۔ یہ اسی چار دیواری کے اندر پہلا سانس لینے کا اثر تھا کہ آج میں اپنے اصل کی جانب لوٹ آئی۔“ وہ جھلمل آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

”میں تم سے پہلے وہاں پہنچ کے تمہارا انتظار کروں گا۔“ ارباز نے اس کے ماتھے پہ دعائیہ بوسہ دیتے ہوئے وعدہ کیا۔

جہاز میں بیٹھ کے اپنی سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے منصف نے گردن موڑ کے اپنے برابر بیٹھی فاطمہ کو دیکھا۔ ٹی پنک کمر کے کلدانی سے بھرے شلواری قمیص میں ملبوس وہ عرصے بعد بہت پرسکون نظر آ رہی تھی۔ اسی رنگ کے دوپٹے کے ہالے میں اس کا گندمی چہرہ کھلا کھلا اور رنور دکھائی دے رہا تھا۔ ہونٹوں پہ ایک نرم سی مسکراہٹ اس کے مطمئن ہونے کو ظاہر کر رہی تھی۔

